ادارۂ فیض القرآن دیوبند

کا

علمی، دینی اور تبلیغی ترجمان

ماہنامہ "مشرب" دیوبند کا

مجاہدِ ملت نمبر

ایڈیٹر

مشہود اقبال عثمانی

اس پرچہ کی قیمت ـــــ ایک روپیہ آٹھ آنہ

سالانہ قیمت ـــــ پانچ روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد ۱۱ — ماہنامہ **مشرب** دیوبند — شمارہ ۶،۷
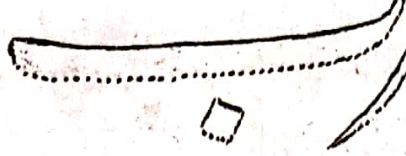
مجاہد ملت نمبر

یہ قیمتی نمبر

مدیر مسئول: مشہود اقبال عثمانی

ایک ایسے مخلص انسان کی یاد دلاتا رہیگا جس نے زندگی کے بہترین لمحات قوم کی خدمت کیلئے وقف کردیئے اور خود کینسر جیسے موذی مرض کے زخم لیئے مصائب اور تکالیف کا شکار رہا۔ ایک ایسے شیر دل انسان کی کہانی جو گولیوں کی بوچھاڑ میں سینہ سپر رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے مظلوم دوستوں پریاں کا پیار، اور باپ کی شفقت نچھاور کرتا رہا۔ ایک ایسے زندہ دل انسان کی زندگی جس نے قوم کو ہنسنا اور جینا سکھایا اور خود مایوس کن تنگ ماحول میں گھٹ گھٹ کر خون کے آنسو روتا رہا۔ ملک کے اس بیش قیمت موتی کے حالات جسے بزرگوں نے پرکھا، کسوٹی پر رکھا اور پارس بنا دیا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دشمنوں کے لیئے موت کا پیغام اور دوستوں کے لیئے محبت کی لطافت سے معمور تھیں۔ اُس کا فہم، اُس کی فراست، اُس کا تدبر، اس کی سیاست، اس کی نیکی اور تقویٰ ہمارے لیئے ایک نظیر ہے۔ وہ ایک جلیل القدر مجاہد، ایک شعلہ بیان مقرر، ایک تقدس سے لبریز فرشتہ، انسان تھا۔ وہ ایک ایسی قوم کا لیڈر تھا جو اُسکی رُوح کے لیئے ناسور اور دل کے لیئے ایک دہکتا ہوا انگارہ بن چکی تھی۔

اس بے مثال نمبر کی قیمت:۔ ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

سالانہ قیمت ہند و پاکستان سے:۔ **پانچ روپے**

غیر ممالک سے:۔ **پندرہ شلنگ**

ترسیلِ زر اور مکمل خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر ماہنامہ مشرب دیوبند ضلع سہارنپور (انڈیا)

پاکستان میں صرف رقم ارسال کرنیکا پتہ

حافظ عزیز الرحمٰن صاحب مکان ۲۲۳ محلہ سنت پورہ

لائل پور (پاکستان)

(مشہود اقبال عثمانی پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپوا کر اپنے دفتر مشرب دیوبند سے شائع کیا)

فہرست مضامین ماہنامہ مشرب (مجاہد ملت نمبر)

بابت ماہ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ء

(افتتاحیہ)

ایک انقلابی جرنیل موت کی آغوش میں

مشہود اقبال عثمانی

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
روتی ہے گلے مل کے سحر شمعِ سحر سے

۱۰ اگست ۱۹۶۲ء کا دن خیریت کے ساتھ گذر چکا تھا۔ جمعہ کی شب دن کے بے پناہ ہنگاموں اور شور وغل کو زیر کر چکی تھی، رات تیزی کے ساتھ اپنے وسیع پر پھیلا چکی تھی۔ آج کی رات مولانا پر تمام راتوں سے زیادہ بہتر گذری آرام اور سکون سے بے نیاز وہ مردِ مجاہد بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا تھا۔ نیم خوابی کے عالم میں کبھی کبھی آہ اور کبھی کبھی کچھ جسم کو لغزش محسوس ہوتی جس سے شبہ ہوتا تھا کہ کرب و بے چینی کی خفیف صورت ابھی باقی ہے۔ دوستوں کو کچھ اطمینان سا ہو چلا تھا کہ شاید یہ مستعار زندگی کے کچھ گنے چنے لمحات اور مل جائیں۔ جمعرات کے روز پھیپھڑوں سے پانی نکالا جا چکا تھا جس کی وجہ سے بے چینی کم ضرور ہوگئی تھی۔ اسی کمرے میں مقیم تیمارداروں نے آج رات مصلحتاً کمرہ تبدیل کر دیا تھا کہ شاید مولانا ہماری نیند کے خراٹوں سے بیدار نہ ہو جائیں آہ! کسے خبر تھی کہ یہ رات مولانا کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔ یہ گہری نیند ابدی نیند میں تبدیل ہو جائے گی یہ آرام و سکون دائمی ہو جائے گا طول و عرض میں پھیلی ہوئی سیاہ رات اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ شباب پر تھی، رات کا ایک بج چکا تھا۔ نئی دہلی کی وسیع سڑکیں ویران ہو چلی تھیں حضرت مولانا کا پھول جیسا مسکراتا ہوا شاداب چہرہ مجسم سکون کی ایک تصویر بن چکا تھا اسی حالت میں وقت تیزی سے گذرتا چلا گیا۔ ساتھی سو چکے تھے۔ یوں ہی رفتہ رفتہ رات ڈھلنے لگی۔ کافی خنکی ہوگئی تھی۔ خادم نے مولانا کو چادر اُڑھائی اور اسی اثناء میں رات کے تین بج گئے۔ رات کی وحشتناک تاریکی دم توڑنے لگی۔ پردہ سیاہ چاک ہوتا نظر آیا کہ یکایک سرہانے مسکراتے ہوئے فرشتے نمودار ہوئے۔ رشتۂ حیات کو آواز دی۔ حکم خداوندی سنایا، مولانا مسکرائے۔ فرشتوں کی صدا پر لبیک کہا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کون چل بسا کس کا رشتۂ حیات منقطع ہو گیا۔ کس نے زندگی کی قید سے نجات پائی۔ یکایک گھڑی نے چار بجائے۔ چند دوست تہجد کی تیاری کر رہے تھے مولانا کو دیکھا تو آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ سنجیدگی، غیر معمولی متانت، بے پناہ رونق۔ چہرے پر ہاتھ رکھا۔ نبضیں دیکھیں۔ دل ٹٹولا۔ جسم سرد ہو چکا تھا۔ کوئی "مجاہد" اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا۔ کسی کی مانگ کا سیندور اُجڑ گیا تھا۔ کچھ بچے یتیم ہو گئے تھے۔ قوم کا رہبر، ملک کا لیڈر۔ محفل کی رونق۔ سفرِ آخرت اختیار کر گیا تھا۔ زعیم ملت موت کے تند و تیز جھونکوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ ملک کا ایک جانباز سپاہی۔ بساطِ سیاست کا ایک ماہر کھلاڑی۔ ملت کا ایک غمخوار، ایک عظیم مفکر، ایک شعلہ بیان مقرر۔ چٹان جیسے عزم کا مالک ایک زبردست عالم باعمل۔ زہد و شرافت کا ایک مجسمہ۔ لازوال کتابوں کا مصنف؛ غریبوں کا ہمدرد، یتیموں اور بے کسوں کا سہارا، مظلوموں کی پشت پناہ۔ ایک

دردمند دل کا مالک۔ ایک ذہین مبصر اور آئینہ سے زیادہ صاف دل رکھنے والا مردِ مسلمان اس ناپائدار زندگی کو ہمیشہ کے لیئے خیرباد کہہ چکا تھا۔ ساتھی اور دوست دم بخود رہ گئے عزیز ہاتھ ملنے لگے۔

کینسر کے موذی مرض سے مایوسی ضرور تھی مگر گذری ہوئی رات کا سکون اور اطمینان دیکھکر یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید "رشتۂ حیات کچھ اور طویل ہوجائے"۔ ملک بھر کے کروڑوں مسلمانوں کی دعاؤں کے صلہ میں مولانا کی زندگی بھیک میں مل جائے ایسے وقت میں جبکہ قوم کے چنے ہوئے ہیرے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ۔ مولانا ابوالکلام آزاد رح جناب رفیع احمد قدوائی مرحوم اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رح جیسے سربراہ ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ مولانا رح کی ذات ہی ایسی نمایاں ہوکر ابھر آئی تھی جن پر ملت کو پورا بھروسہ اور اطمینان تھا یہ زخم ابھی ہرے ہی تھے کہ ایک اور کاری زخم لگ گیا۔

تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق جب ہم نے کوئی شاخ چُنی شاخ جل گئی

مقدورِ الٰہی میں کسے دخل ہے حق تعالیٰ کی بے پناہ رحمتوں اور نوازشوں کے باوجود مشیتِ ایزدی کا یہ سلوک اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی شخص دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ قوم کے اس ہونہار سپوت کے انتقال کی خبر آل انڈیا ریڈیو سے صبح کی خبروں میں براڈکاسٹ ہوئی اور متواتر ہوتی رہی، دوپہر ہوتے ہوتے ہزاروں افراد کا اجتماع ہوگیا عجیب رقت آمیز منظر تھا۔ ہر شخص خاموش آنکھوں میں عقیدت کے آنسو لیئے ہوئے نظر آیا آخر وہ وقت بھی آیا جب اس محسن قوم، رہبر ملک اور بے مثال عالم باعمل کا جنازہ نماز کے لیئے چلا۔ بے شمار ملک کے سرکردہ افراد اور ہزاروں عقیدت کیش لوگوں کے ساتھ یہ جم غفیر بیرون دہلی گیٹ پہنچا۔ جہاں تقریباً پچاس ہزار افراد نے نماز جنازہ ادا کی۔ اس خوش نصیب مجاہد کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رح کے والد بزرگوار مولانا حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رح کے سرہانے دفن کردیا گیا اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اولیاء اللہ آغوش پھیلائے ہوئے منتظر تھے ؎

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

انتقال سے کچھ عرصہ قبل ہی مولانا نے ایک خواب دیکھا تھا جبکہ وہ ایک رات حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر ترقیات کی کوٹھی پر سو رہے تھے۔ سامنے صوفے پڑے ہوئے تھے اور مولانا پلنگ پر دراز تھے کہ یکایک غنودگی کی کیفیت طاری ہوئی۔ مولانا نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر ایک بڑا زہریلا سانپ بیٹھا ہے اور اس سانپ کے نزدیک دو نیولے بیٹھے ہیں جن میں ایک چھوٹا ہے اور دوسرا بڑا۔ یہ دونوں نیولے سانپ کو باہر نکالنے کی کوشش کررہے ہیں۔ چاروں طرف سے دروازے بند ہیں۔ کمرے میں نہ کوئی نالی ہے اور نہ کوئی سوراخ۔ مولانا فرماتے تھے کہ میں نے سانپ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ سانپ بولا کہ میں تمہارا رفیق "موت" ہوں۔ پھر مولانا نیولوں سے مخاطب ہوئے اور ان سے بھی وہی سوال کیا۔ اس پر بڑے نیولے نے کہا کہ میں ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی دعائیں ہوں۔ پھر چھوٹے نیولے نے کہا کہ میں عالم اسلام کے مسلمانوں کی دعائیں ہوں۔ اور ہم اس سانپ کو باہر نکالنا چاہتے ہیں اس پر مولانا نے دریافت کیا کہ تم کس طرح سانپ کو باہر نکال سکتے ہو جبکہ کمرے میں نہ کوئی سوراخ ہے اور

نہ کوئی راستہ۔ اس پر نیولے نے جواب دیا کہ نہیں نہ راستہ کی ضرورت ہے نہ سوراخ کی، ہم اس پر قادر ہیں کہ پھر بھی سانپ کو باہر نکال دیں اور اس کے فوراً ہی بعد آنکھ کھل گئی — اور آخرکار یہ خواب سچا ہوا۔ وہ "سانپ" نہ نکل سکا۔ مولانا کچھ ہی عرصہ بعد انتقال فرماگئے۔

اس موقعہ پر دُعاء اور اس کی تاثیر کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دعاء مصیبتوں اور مشکلات کو دفع کرتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب آسمان سے بلاؤں اور آفتوں کا نزول ہوتا ہے تو زمین سے آسمان کی طرف جانے والی دعائیں ان سے ٹکراتی ہیں اور لڑتی بھڑتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔

انتقال کے کچھ ہی روز بعد مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند نے خواب میں دیکھا کہ عالم برزخ کا وسیع میدان ہے اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک عظیم مجمع کے سامنے حالاتِ برزخ بیان فرما رہے ہیں۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ عالم برزخ کے حالات کا انکشاف مولانا کچھ اس انداز میں کر رہے ہیں کہ عوام اپنی کم علمی کی وجہ سے اور علماء اپنی کم فہمی کی وجہ سے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مولاناؒ کی تقریر خود مفتی صاحب کو بھی یاد نہیں رہی۔ مگر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے دُنیا میں جو حالات برزخ کے متعلق سنے تھے وہ تو کچھ اور ہی تھے اور یہاں حالات کچھ اور ہی ہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ کیسا رہا؟

مجاہد ملت رح نے جواب دیا۔ بہت اچھا، بالکل اطمینان اور سکون سے ہوں مجھے کوئی تکلیف نہیں۔

ایک موقع پر حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ رائے پوری نے فرمایا کہ مجاہد ملت رح نے ۱۹۴۷ء کے بعد جو خدمات انجام دی ہیں وہ ذخیرۂ آخرت ہیں۔ میری عمر بھر کی عبادت کے بدلہ میں یہ ذخیرہ ہاتھ آجائے تو میں فائدہ محسوس کروں گا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی سرزمین پر طوفانی بھونچال آیا جس میں دہلی کا تمدن، مسلمانوں کی معاشرت بلکہ ساری زندگی زیر و زبر ہو کر رہ گئی تھی فرقہ ورانہ کشیدگی کی وجہ سے خونی ہنگامہ شباب پر تھا۔ دہلی کے چپے چپے سے آہ و بکا کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ لوگ گھر سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس موقع پر مولانا ایک مرتبہ شہر کا گشت لگا رہے تھے۔ اچانک دیکھا کہ کچھ نہتے مسلمان کسی مومن کی نمازِ جنازہ کی تیاری کر رہے ہیں جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے۔ مولانا رح تیزی سے اس مقام پر پہونچے تو صف بندی ہو چکی تھی اور امام نے نیت باندھ لی تھی۔ چند بے خوف، جری، صاحب ایمان مسلمان اس مالک حقیقی کے سامنے اپنے مسلمان بھائی کی مغفرت کے لیئے دعاء کر رہے تھے جو ظلم کا شکار ہو گیا تھا۔ مولانا رح کی نظر اچانک سامنے پڑی تو کچھ اور ہی ماجرا نظر آیا سامنے کچھ فوجی جو اسلحہ سے لیس تھے آگے بڑھے چلے آرہے ہیں۔ ملٹری کے یہ جوان جن کا ظلم نقطۂ عروج پر تھا۔ جن کے خونخوار ارادے اور تمتماتے ہوئے سرخ چہرے پوری طرح سے دیوانگی کے اثرات لیئے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان درندوں نے مظلوم، بے بس، اور نہتے مسلمانوں پر گولی چلانے کا ارادہ کیا مولانا نے دیکھا کہ ایک اچھی خاصی مسلمانوں کی تعداد جو عبادتِ الٰہی میں مشغول ہے موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی اگر ان پر چند ثانیے اور بیت جائیں تو یقیناً ان میں سے کوئی نہ بچ سکے گا اس وحشتناک منظر کو دیکھکر مولانا موٹر سے کود پڑے

اور آناً فاناً میں ان لٹیرے نوجیوں کے سامنے آگئے بڑی پھرتی سے آگے بڑھے اور پوچھا کہ ان "نہتے مسلمانوں پر" گولی چلانے کا تمہیں کس نے اختیار دیا؟ مولانا کی پُر وقار آواز کانپ رہی تھی قومی غیرت اور حمیت کے ملے جلے جذبات نے مولانا کو فرشتہ رحمت بنا کر بھیجا تھا فوجی سپاہی مولانا کی اس بے باکی اور غیر معمولی شجاعت پر ششدر رہ گئے۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ یہ سب مسلمان مل کر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ کیا یہ نہتے مسلمان جن کے سامنے ایک بھائی کا جنازہ رکھا ہے تم پر حملہ کر سکتے ہیں؟ اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمانوں کے خون سے اس طرح ہولی کھیلو تو یہ "حفظ الرحمن" کی زندگی تک ممکن نہیں۔ میں ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گا۔ مولانا کے آہنی ارادوں نے ان وحشیوں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ ✣ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

نہ جانے کتنے ہی ایسے واقعات ہیں جن کو تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ایک وقت آئے گا جب تاریخ دہرائی جائے گی اور آنے والی نسلیں اس عظیم رہنما کی یاد میں آنسو بہائیں گی۔

حیدرآباد میں جس وقت پلیس ایکشن ہوا تو میں وہیں مقیم تھا وہ دن بھی ذہن سے دور نہیں ہو سکتے جب وحشتناک خبریں اور شدید ہنگامہ کا خطرہ سر پہ منڈلا رہا تھا، مسلم خون ارزاں اور زندگی سستی تھی۔ دشمن کی تیغ بے نیام تھی مسلمانوں کا کوئی والی وارث نہیں تھا دوستوں نے ترکِ وطن کر لیا تھا دشمن پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھے مگر اس پُر آشوب دور میں بھی مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے والی ذات، مولانا حفظ الرحمن ہی تھے اس نے مسلمانوں کو نئی ہمت دی نئے حوصلے دیئے، نئی طاقت دی، اس نے اپنی تقریروں میں بتایا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے جہاں فرقہ وارانہ بنیاد پر ظلم نہیں ہو سکتا مسلمان پاکستان کے نام سے دبائے نہیں جا سکتے اس کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو ہندوستان کے کسی اکثریتی فرقہ کو حاصل ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانوں کا سیاسی شعور بیدار ہو چکا ہے وہ اپنی اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔

۴۷ء کے ہنگاموں میں جب مسلمانانِ دہلی ظالموں کی سفاکی اور خونریزی کے شکار تھے محلہ در محلہ جا کر مولانا نے نئی امنگ اور نئے حوصلہ کا پیغام دیا، ان مصائب و آلام میں گھرے ہوئے مسلمانوں کے لیے سردار پٹیل نے مولانا کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی۔ سردار پٹیل نے بتایا کہ مسلمانوں کی حفاظت کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ سب مسلمان کسی ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیئے جائیں اور فوجی پہرے میں ان کی نگہداشت ہوتی رہے۔ گویا ؎

مجھکو مضطر دیکھکر کہتا ہے قاتل پیار سے ✣ آ ادھر سائے میں سو جا دامنِ شمشیر کے

مگر اس موقعہ پر بھی مولانا کی دور رس نظریں اور تدبر و فراست نے اس تجویز کے پشت پر خوفناک خطرے کو بروقت محسوس کیا اور سردار پٹیل کی اس "انوکھی اسکیم" کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ مولانا نے سردار پٹیل سے کہا کہ مسلمان اپنی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے اور میں اسے خدا کے سپرد کرتا ہوں

انہی ہنگامی دنوں میں یہ معمول رہا کہ صبح کی نماز کے بعد چائے کی ایک پیالی پی کر دفتر جمعیۃ سے شہر کے دورہ پر نکلتے، فساد زدہ علاقوں کا معائنہ کرتے، ہسپتالوں میں زخمیوں کا جائزہ لیتے، افسران کو جھنجھوڑتے گرفتار شدگان کی ضمانت کا انتظام کرتے اس طرح گیارہ بجے رات کو واپس آتے اس وقت تک کھانا ٹھنڈا ہو جاتا، دوست، احباب عرض کرتے کہ حضرت آپ کے دیر سے آنے کی وجہ سے کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے

تو ایک دفعہ فرمایا، "ڈھونڈا مل تو جاتا ہے اس وقت تو بہت سی مخلوق ایسی ہے جو ایک ایک دانہ کو ترس رہی ہے"۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب غازی پانی پتی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ حضرت ضلع بجنور کے حالات خراب ہوچکے ہیں، آپ بچوں کو دہلی لے آیئے تو فرمایا کہ، "وہ میرے بچے ہیں اس لیے کہتے ہو مشرقی پنجاب اور دہلی میں جو اللہ کی مخلوق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر جو زمین تنگ ہے اسکو چھوڑ دوں؟ حق تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ بے شک اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کے اجر ضائع نہیں کرتا۔

یاد کیجئے مولانا کے اخلاقِ حمیدہ کو جن کا آج کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ سردُھنیئے ان کے کارناموں پر جو قوم کی گردن پر ایک بہت بڑا احسان ہیں یقیناً دُنیا فانی ہے اور جو بھی آئے گا مرنے کے لیئے آئے گا۔

حدیث شریف میں ہے مَرَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم بِقُبُوْرِ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ السلام عليكم يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ وَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَ لَكُمْ اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ (ترمذی) مدینے والوں کی قبروں کے پاس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا آپ نے ان کی طرف اپنا رخ کیا اور کہا اے قبروں والو تم پر امن ہو، خدا تمہیں بخشے اور ہمیں۔ تم ہمارے آگے گئے اور ہم پیچھے آئیں گے۔

یہی ہورہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا جب تک قیامت مسلط نہ ہوجائے یہاں کی تو نہ فصلِ بہار پر بھروسہ نہ خزاں پر اعتماد۔ نہ زندگی کے عیش وآرام مدام ہیں اور نہ ہی غریبی مفلسی اور بدحالی ہی دیرپا ہے۔ یہاں شہنائیوں میں غم کے نغمے پوشیدہ نظر آئے اور غم آلود زندگی میں خوشی کے مسکراتے ہوئے گل بھی کھلتے دیکھے، دنیا ایک طلسم ہے جو اس طلسم کی زد میں آئے حقیقت سے کوسوں دور نکل گئے۔

مولانا کو اساتذہ سے بے پناہ خلوص اور عقیدت تھی، بے پایاں تعلق تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رح اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح کی شاگردی کا شرف حاصل کیا جن کی دور اندیش نگاہوں نے اس دُرِّ بیش قیمت کو پرکھا، کسوٹی پر رکھا اور پارس بنادیا حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح سے سیاسی اختلافات کے باوجود کبھی ٹکرانے کی جرأت نہیں کی، ملتے تو عزت واحترام کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ اساتذہ کے دلوں میں محبت اور عظمت کا ایک لافانی جذبہ اور انمٹ نقوش مرتسم ہوگئے تھے۔

آپ کے مخصوص ساتھیوں میں حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ مولانا محمد میاں صاحب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا کی جامع شخصیت گوناگوں خصوصیات پر مشتمل تھی، کسی دردمند کی پکار ان کے لیئے تازیانے سے کم نہ تھی جہاں اس کے لیئے ان کے دل میں پوری ہمدردی اور کام کرنے کا جذبہ موجزن ہوتا وہاں وہ اسے ایسی دھمکی بھی دیدیتے کہ ضرورتمند ایک دفعہ لرز جاتا اور کبھی کبھی مایوس ہوکر لوٹ آتا۔ اکثر وقت

میں نے دیکھا کہ ضرورتمند آتے بہت متانت اور سنجیدگی سے مولانا کے سامنے اپنی مشکلات کا اظہار کرتے مولانا شفقت آمیز غصّہ کے ساتھ بھڑک اُٹھتے، اس پر تحقیقی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے یہاں تک کہ وہ مایوس ہوکر چلا جاتا مگر مشکل سے وہ گھر تک پہنچ پاتا تھا کہ مولانا اس کی متعلقہ ضرورت پوری کر دیتے اکثر ضرورتمند کو دیکھتے تو خود چھیڑنے لگتے۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ ایک غریب شخص دفتر جمعیۃ کے دالان میں بیٹھا ہوا تھا مولانا دفعتًا باہر سے آئے اور بیٹھ گئے کافی دیر ہوگئی۔ مگر وہ اجنبی خاموش رہا تو پھر خود ہی اسے چھیڑنے لگے

"کیوں آئے ہو؟ دفتر کو گھر سمجھ رکھا ہے۔ جی چاہا اور چلے آئے۔ روپے لینے ہوں گے۔ مگر میں ہرگز روپے نہیں دوں گا پیسے کوئی درخت پر لگتے ہیں؟"

یہ کہکر ایک روپیہ بڑھا دیا پھر خود ہی کہنے لگے

"آپ ایک روپیہ سے کیوں خوش ہونے لگے اچھا یہ دو روپے لے لیجئے"

وہ اجنبی پھر بھی چپ سادھے رہا۔ گردن جھکائے مولانا کی خاص عادتوں کو پرکھ رہا تھا۔ یہانتک کہ مولانا نے بغیر مانگے ہی پانچ روپے دیدیئے۔

بہت کم ایسا ہوتا کہ کسی ضرورتمند کی ضرورت پوری نہ ہوئی ہو۔ جن لوگوں نے مولانا کے اس وصف کو جان لیا تھا وہ بے جا اصرار بھی کرتے، باقاعدہ جنگ ہوتی یہاں تک کہ تیز گفتاری کی نوبت آجاتی مگر مجال ہے جو کبھی دل میں مَیل آجائے، لڑتے اور لڑنے والے کا کام کرنا اپنے لیئے فرضِ عین سمجھتے۔

غصّہ آتا تھا لیکن سریع الزوال، مولانا کا قلب انتقام اور مخالفت کے جذبوں سے خالی تھا۔ شفقت کا یہ عالم تھا کہ دفتر کے معمولی سے معمولی ملازم سے سخت سست سن کر بھی خاموش ہوجاتے، دشمنوں کو ہمیشہ معاف کرتے۔ ہمیشہ تعمیری کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔ اکثر کہتے تھے کہ میں تو ہر اس قوم وملت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں جو کمزور ہو مگر کیا کریں آزادی کے بعد اتفاق سے مسلمان ہی تختۂ ستم بنائے گئے اس لیئے قدرتی طور پر میری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوگئیں۔

اللہ اللہ کن کن باتوں کو یاد کیجئے کن کن پر آنسو بہائیے۔ مولانا نے تمام عمر اس قوم کی خدمت کی جو نا قدر شناسی میں طاق ہے جس نے مولانا کی ہنسی اُڑائی، ان کے مشن کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی بارہا قتل کے خطرناک منصوبے بنائے، سازشوں کے وسیع جال پھیلائے۔ ان کو جیل جاتے دیکھکر اینٹیں اور پتھر برسائے لیکن وہ پھر بھی مسکراتے رہے، ایک آنے والی صبح کے انتظار میں پھر قدرت نے وہ دن بھی دکھائے جب ہندوستان آزاد ہوگیا اور ہندوستانی مسلمان بیکس وبے سہارا بن گئے، وہ ہم سے ایسے وقت میں جدا ہوگئے جب قوم اور ملک کو ان کی سخت ضرورت تھی، اب کون ہے جو اس کا ثانی بن سکے، اس کے مشن کو چلا سکے، فرقہ واریت اور ظلم کے خلاف آواز اُٹھا سکے، اپنے جسم پر موذی امراض کے زخم لیئے قوم کے لیئے رات دن مارا مارا پھرے۔ جسے نہ اپنی شہرت کی غرض ہو نہ روپے پیسے سے پیار، حق تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔ اور آخرت میں اعلیٰ مدارج پر فائز فرمائے آمین۔

کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی ٭ جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

مولانا کے انتقال کے بعد فرداً فرداً ہماری ذمہ داریوں میں قدرتی اضافہ ہوجاتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے باپ کے انتقال کے بعد قدرتی طور پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ ہمیں اپنی ہمتوں کو پست اور حوصلوں کو مدھم نہیں کرنا چاہیئے قومی یک جہتی کے لیئے آپس کے اختلافات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ایک زندہ قوم میں حق تعالیٰ پھر ایک دوسرا مجاہد ملت پیدا فرمائے۔ آمین۔

ضروری ہدایت

ہم نے بار بار اعلان کیا ہے کہ ہمارے مخلص کرم فرما خریداران مشرب خط لکھتے وقت اپنا خریداری نمبر پوری توجہ کے ساتھ تحریر کریں جو پتہ کی چٹ پر پیشانی پر لکھا ہوا ہوتا ہے لیکن اکثر دوست اس طرف توجہ نہیں کرتے جس کی وجہ سے دفتر کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس دفعہ ایک بار ہم پھر اسی کی یاد دہانی کرارہے ہیں جو آپ کی پوری توجہ کی مستحق ہے۔

سرکولیشن منیجر

ماہنامہ "مشرب" دیوبند

کیا آپ جانتے ہیں

سعدیہ لائبریری

• شیخ سعدیؒ کی یادگار • شائقین علم و ادب کی مرکز نگاہ • ادبی اور مذہبی کتابوں کا مخزن • اتحاد و یک جہتی کا نشان
• ملت کی مخلصانہ خادم • حصول ثواب کا وسیلہ • ہر طرح کے لٹریچر سے بھرپور • دیوبند کی عظیم الشان لائبریری

ہمیں امید ہے کہ ملک کا سمجھدار طبقہ اس لائبریری کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر دامے، درمے، قدمے، سخنے اس کی اعانت سے گریز نہ کرے گا۔

ارسال کردہ کتابوں اور دیگر عطیات کی پختہ رسید دی جائیگی، نیز معاونین کے نام اور پتے اسی طرح ماہنامہ مغرب میں شائع ہوتے رہیں گے۔

اسمائے گرامی	عطیہ	اسمائے گرامی	عطیہ
جناب عبدالجبار صاحب کلکتہ ۱۲	مبلغ بیس (۲۰) روپے	جناب محمد اسلام صاحب صدیقی دہلی	۵ عدد ادبی کتب
جناب عشرت علی صاحب نامی رڑکی	" انیس روپے پچھتر نئے پیسے	" مولوی نورالحسن صاحب دیوبند	۴ عدد دینی کتب
" شمس الحق صاحب دہلی	" دس روپے	" اخلاق احمد صاحب دیوبند	۲۰ " ادبی "
" مشہود اقبال عثمانی دیوبند	۸۰ عدد اسلامی کتب	" مولوی محمد طاہر صاحب دربھنگہ	۴ " " "
" مقبول احمد صاحب دیوبند	۱۵ " "	" محترمہ صابرہ بیگم صاحبہ سہارنپور	۵ " " "
" مفتی کفیل الرحمٰن صاحب نشاط دیوبند	۳۰ " "	" سید ازہر شاہ قیصر دیوبند	۱ " دینی "
" عبدالعلی صاحب دیوبند	۱۵ " ادبی کتب	" خالد حسن صاحب لاہور	۲۵ " "
" افضال الٰہی صاحب دیوبند	۱۰ " " "	" مولوی ابوالحسن صاحب بارہ بنکی	۱۰ عدد مختلف فنون
" افروز احمد صاحب دیوبند	۱۰ " " "	" مولوی صدیق احمد صاحب پنجاب	۵ " ادبی کتب
" وجاہت عثمانی صاحب دیوبند	۱۲ " " "	" عبدالجبار صاحب کلکتہ ۱۲	۳ " دینی کتب
" سید احمد صاحب گل "	۸ " " "	" مسعود احمد صاحب گل دیوبند	۳ " ادبی "
" مولوی سالم صاحب قاسمی "	۱۰ " " "	" ماسٹر انعام الرحمٰن صاحب دیوبند	۳ " "
محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ علیگڈھ	۱۰ " " "	" رفیع الرحمٰن صاحب "	۱ " "
جناب مولوی شاہد حسن صاحب دیوبند	۳۲ " دینی "	" ریاست علی صاحب بجنوری "	ایضاح البخاری ہر ماہ ایک عدد
محترمہ شاہدہ شاہین صاحبہ بمبئی	۱۰ " " "	" مولوی سید عبدالرؤف صاحب "	معارف المشکوٰۃ " "
جناب خواجہ محمد بلال صاحب دیوبند	۵ " " "	" اظہر صاحب صدیقی دیوبند	معالم التنزیل " "
" زاہد حسن صاحب خوشنویس "	۵ " " "	" حافظ اخلاق احمد صاحب "	اشرف المواعظ " "
" حافظ اخلاق احمد صاحب دیوبند	۵ " "	" اظہر صاحب عثمانی "	۷ عدد ادبی کتب
" مولوی ارشد صاحب کانپوری "	۱۵ " "	" مختار احمد صاحب "	۵ عدد دینی کتب
" سید محبوب رضوی صاحب "	۵ " اسلامی کتب	" اکرام صاحب بی اے "	۴ عدد " "

انوارالحق صاحب لائبریرین سعدیہ لائبریری دیوبند۔ یوپی

پاکستانی حضرات پتہ ذیل پر امدادی رقوم ارسال فرما کر رسید منی آرڈر سعدیہ لائبریری کے نام روانہ فرمادیں پتہ یہ ہے محمد ذکی صاحب ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور

پیدائش سے لے کر موت تک بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت پر پہلی محققانہ کتاب

اسلام کا نظامِ تربیت

از مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے جوان ہو کر قوم و ملک کے معمار اور ملت و مذہب کے پاسبان بنیں اور یہ کہ ان کا ظاہر و باطن پاک ہو، اُن میں خدا کا خوف، ماں باپ کی اطاعت، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے محبت کا جذبہ پروان چڑھے تو آپ "اسلام کا نظام تربیت" پڑھیئے جس میں تفصیل کے ساتھ بچوں کی تربیت و تعلیم پر کتاب وسنت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں والدین، سرپرستوں اور اساتذہ کے فرائض کیا ہیں اور انھیں کس طرح اپنا یہ فریضہ ادا کرنا چاہیئے۔

کلمات۔ اذان۔ عقیقہ۔ اچھے نام۔ ختنہ۔ گوشوارہ۔ پرورش کی ذمہ داری۔ ماں باپ کے فرائض۔ مذہبی تعلیم۔ اولاد کے سلسلہ میں انبیاء کرام کا اسوۂ حسنہ۔ اولاد کے حق میں دعا اور بد دعا۔ کی اہمیت تعلیم گاہوں اور ان کے منتظمین کی سیرت سازی کے سلسلہ میں ذمہ داریاں۔ شادی۔ یہ اور اس طرح کے بیسیوں دوسرے عنوانات پر جچی تلی بحث، نیز بچوں سے متعلق دوسرے اہم جزئی مسائل کی تفصیل کا بہترین مجموعہ۔ زبان و بیان سادہ وسلیس اور شگفتہ۔ کتابت و طباعت معیاری۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات

قیمت مجلد مع ڈسٹ کور تین روپے

تذکرہ مشائخ دیوبند

مشائخ دیوبند کی دو صد سالہ تاریخ، تصوف۔ چھیالیس اخبارات و رسائل اور کتابوں کا نچوڑ۔ ہر مسلمان کے لیئے قابلِ مطالعہ قیمت صرف چار روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ مشرب دیوبند (یو پی)

فلسفۂ فطرتِ اسلام

مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی
پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی آندھرا پردیش

(گذشتہ سے پیوستہ)

معلوم ہوا کہ اسلام انسانی فطرت سے بحث کرتا ہے اور اس کے جملہ احکام درحقیقت انسانی فطرت کی طلب کو پورا کرنے اور مقصدِ انسانیت کو مکمل کرنے والے ہیں۔ انسانی فطرت کی تحلیل کیجئے تو اس کے دو بنیادی ارکان جسم اور روح نکلیں گے۔ یہ دونوں (جسم اور روح) اس عالم میں لازم و ملزوم ہیں کوئی جسم انسانی بدون روح کے اور کوئی روحِ انسانی بغیر جسم کے اس دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا مذہب حق یا انسان کا فطری مذہب وہی ہوسکتا ہے۔ جو دونوں سے اس طرح بحث کرے کہ اس کے احکام مادی اور روحانی اعتبار سے ملے جُلے ہوں۔ انسان کی جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی زندگیوں کے لیے رہنما ہوں۔

اس خصوصیت کے لحاظ سے مذہب اسلام تمام دنیا کے مذاہب میں انوکھا اور الگ محسوس ہوتا ہے۔ مذہب اسلام میں مادیت اور روحانیت کو اس طرح آمیز کردیا گیا ہے کہ نہ روحانیت مادیت سے جُدا معلوم ہوتی ہے اور نہ مادیت روحانیت سے۔ مکمل مذہب کی علامت بھی یہی ہے اور ایسا ہی مذہب انسان کا فطری مذہب ہوسکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے آپ دنیا کے تمام مذاہب کو دو قسموں میں منقسم کرسکتے ہیں اول صرف روحانی۔ دوسرے صرف مادّی۔ اور اگر اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب میں کسی حد تک مادّی اور روحانی دونوں پہلو پائے بھی جاتے ہیں تو وہ اَن مِل اور بے جوڑ ہیں۔ یہ کیمیا صرف اور صرف اسلام ہی نے بنائی ہے کہ روحانیت اور مادّیت کا پیوند اور جوڑ اس طرح لگایا ہے کہ ہر ایک چیز اپنی فطری بلند حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے اس طرح ملی جُلی نظر آتی ہے جیسے اس دنیا میں جسم اور روح ایک ہوگئے ہیں۔

اس لحاظ سے اسلام نے دنیا کے سامنے دو دعوے پیش کیے ہیں:۔

اول:۔ الیوم اکملت لکم دینکم (قرآن) — اب مکمل کر دیا ہم نے اے انسانو! تمہارے لیے دین و مذہب کو۔

دوم:۔ کلُّ مولودٍ یولد علی فطرۃ الاسلام — ہر انسانی بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

کیا دنیا اس سے انکار کرسکتی ہے کہ:۔

مادی اور روحانی احکام کے آمیز ہونے کے اعتبار سے انسانی فطرت کے مطابق اس کی طلب اور مانگ کو پورا کرنے والا اور فطرتِ انسانی کے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے والا مذہب صرف اور صرف اسلام ہی ہے۔ اسلام کی اس خصوصیت کا اقرار میرے کئی غیرمسلم دوستوں نے وسعتِ تہذیب کے ساتھ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا تقریر سے اس طرف اشارہ ہے۔

قرآنِ کریم کے کیمیائی دو اصول

قرآنِ کریم نے بتایا کہ یہ پوری کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔ بنی آدم کے لیے مسخر اور مطیع کردی گئی ہے۔

(۱) خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا؛ اے انسانو! تمہارے، استفادے کے لیے زمین کی تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔

(۲) سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا؛ تمہارے لیے تمام اشیاء مسخر کردی ہیں۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کائناتِ مادی سے اعراض ونفور نہ کرے بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے فائدہ اٹھائے۔ اس کو اپنے کام میں لائے۔ سورج، چاند اور فضا میں بکھری ہوئی سب قوتیں انسانی علم و تجربہ کے آگے مسخر ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ پوری توانائی اور جد و جہد کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھائے۔ برّ و بحر کی چھان بین کرے اور ان کی تہہ سے تمام گوہر نایاب نکال کر اپنی زندگی کا تاج سنوارے۔ اسلام کے اس اصول کے تحت تمام علومِ جدیدہ کی تحصیل اور اُن کے لیے جد و جہد کرنا اور دنیائے انسانیت کی راہ کے ذریعہ خدمت کرنا سب کچھ آجاتا ہے۔ اور مسلمان کا فرض ہے کہ علومِ جدیدہ اور نئے نئے تجربوں کی جد و جہد میں آگے آگے رہے۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں نے مادیات کو روحانیات سے الگ کر کے اپنی زندگی کے عملی نمونہ سے دنیا پر یہ ثابت کردیا کہ علومِ جدیدہ اور انکشافات سائنس کو مذہب اسلام سے کوئی گہرا تعلق نہیں۔ بلکہ یہ لوگ ان علوم کو اسلام اور اس کی تعلیم سے منافی اور متضاد سمجھنے لگے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا تعبّدی مذہب ہے۔ جس کا زندگی کی مادّی کشمکش اور علومِ جدیدہ کی بہتی ہوئی رَو سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس۔ انجنیری۔ ڈاکٹری اور دیگر علومِ جدید کی تعلیم نہ صرف غیر مذہبی سمجھی جانے لگی بلکہ مذہب کی مقابل اور مذہب کی حریف سمجھی گئی۔ اس لیے آج دنیائے اسلام پستی اور ذِلّت کے گڑھے میں اس طرح گر چکی ہے کہ اس گڑھے سے نکلنے کے لیے وہ غیروں کی محتاج وفقیر ہے حالانکہ مادّیات سے استفادے کا یہ اصول اسلام کے بنیادی حقائق میں سے اہم حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اصول سے انحراف مسلمانوں کی مادّی پستی کا باعث ہے۔

اہلِ یورپ نے اسلام کے اس فطری اصول کو اس طرح اپنایا اور اس طریقہ پر جدّ و جہد کی کہ آج ان کے انکشافات و ایجادات سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح اللہ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کے لیے مسخر کردیا ہے۔ اسلام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ خود انسان اللہ کی عبادت و معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ گویا اس پوری کائنات سے فائدہ اٹھاتا ہوا انسان خدا کے حکم کے آگے سربسجود رہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔ اور قرآن کو جو قانونِ الٰہی ہے اپنی زندگی کا نصب العین بنائے۔ پیغمبرانِ کرام کے ارشادات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ؛ ہم نے جن اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

افسوس کہ یورپ کی قوموں نے جس قدر مکمل طریقہ پر اسلام کے پہلے اصول پر عمل کیا اسی قدر مکمل طریقہ پر اسلام کے اس دوسرے اصول کا بائیکاٹ کردیا۔

خدا کے وجود اور اس کی عبادت و معرفت سے مطلقاً انحراف و اعراض کیا گیا اور اس طرح اس کی بنائی ہوئی قدرتی چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود خدا ہی سے بغاوت و سرکشی کی۔

حالانکہ انسانی فطری مذہب یہی تھا کہ ایک طرف اس کی کائنات سے مکمل فائدہ اُٹھایا جائے اور دوسری طرف خدا کی مکمل عبادت اور معرفت کی طرف متوجہ ہوکر آنے والی زندگی کو دائمی راحت کی زندگی بنایا جائے۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ لے چلنا ہی مذہب، اور سیاست۔حکومت و اخلاق کا آمیزہ بنانا ہے جو انسان کی زندگی کی فطری شاہراہ ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اصول کو بڑی وضاحت سے پیش فرمایا ہے آپ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:۔

کائنات۔ انسان۔ خدا۔ تمام موجودات کا خلاصہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انسان کو خداوند تعالیٰ نے کس لیے پیدا فرمایا ہے؟ کیا انسان جیسی عظیم ہستی کی تخلیق کسی مقصد عظیم کے لیے نہیں ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (قرآن) اے انسانو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد بیکار پیدا کر دیا ہے اور تم بلاشک ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤگے

عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ انسان کو کسی عظیم مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ انسان کو آپ ایک طرف رکھیئے اب دو چیزیں اور ہیں ایک وسیع و بسیط کائنات، دوسرے خدا۔ تو انسان یا کائنات کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہوگا، یا خدا کے لیے۔ سو انسان خود کائنات کے لیے نہیں بنایا گیا۔ بلکہ خود کائنات انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ انسانی زندگی کی بقا اور اس کے سامان سب کائنات کی اشیاء سے فراہم ہوتے ہیں۔ کائنات اور اس کی اشیاء اگر معدوم ہوجائیں تو ایک آن بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ گھاس کا ایک تنکہ بھی اگر معدوم ہوجائے تو انسانی ضرورت پوری نہ ہوسکے اور کچھ نہ کچھ انسان کو نقصان ضرور پہونچے۔ موجودہ علوم اور اس کے لیے انسانی جدوجہد نے یہ امر صاف طور سے حل کر دیا ہے کہ پوری کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔ خود انسان اگر دنیا سے معدوم ہوجائے تو کائنات کی کسی چیز کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ دریا یوں ہی بہتے رہیں گے۔ ہوائیں یونہی چلتی رہیں گی۔ سورج اور چاند یوں ہی چمکتے رہیں۔ کائنات کے ایک ذرّے کا بھی انسان کے معدوم ہوجانے سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ واضح ہوگیا کہ انسان کو کائنات کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ خود کائنات کو اور اس کی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

اب صرف خدا ہی باقی ہے اگر انسان کسی لیے پیدا کیا گیا ہے تو خدا ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر انسان کی پیدائش خدا کے لیے بھی نہیں تو پھر تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی پیدائش کسی کے لیے نہیں، بلکہ عبث اور بے مقصد ہے اور یہ عقل تسلیم نہیں کرسکتی کہ ذرّہ ذرّہ عالم کا با مقصد پیدا کیا گیا ہو اور انسان جیسی عظیم ہستی عبث اور بے مقصد پیدا کی گئی ہو۔ اسی مضمون کو قرآن نے بیان کیا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ ہم نے جن اور انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

خدا کو منظور ہوا کہ اس کی معرفت اور عبادت کرنے والی کوئی مخلوق ہو اور اس کے لیے اس نے انسان کو بنایا اور پوری کائنات کو اس کا خادم بنا دیا۔

یہی انسانی خلافت کی تفسیر ہے کہ پوری کائنات کا امام انسان ہے۔ اور خود انسان خدا کا بندہ، غلام

اور فرمانبردار ہے۔
یہ امر کہ انسان کائنات سے فائدہ اٹھانے کے لیئے اور کائنات انسان کو فائدہ پہنچانے کے لیئے پیدا کی گئی ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے گھاس دانہ گھوڑے کے کھانے کے لئے اور گھوڑا گھاس دانہ کھانے کے لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ گھوڑا گھاس دانہ کھا کر کس مقصد کے لیئے ہے۔ اس کا جواب صاف ہے کہ مالک و آقا کی اطاعت کے لیئے۔ بس یوں سمجھیئے کہ انسان کائنات سے فائدہ اٹھا کر خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لیئے پیدا کیا گیا ہے اور اس سے انکار کرنا انسان کی تخلیق کو عبث اور بے مقصد قرار دینا ہے۔

میں خود خدا کے لیئے کائنات میرے لیئے
یہی اصول ہے رازِ حیات میرے لیئے
اسی اصول پہ موقوف زندگی میری
اسی طریق میں ہے بس نجات میرے لیئے
اسی کا اخذ ہے معراج میری ہستی کی
اسی کا ترک یقیناً ممات میرے لیئے
اسی میں فلسفۂ خلقِ انس مضمر ہے
اسی اصول میں پنہاں ثبات میرے لیئے
اسی سے دین بھی اچھا تھا اور دنیا بھی
یہ بس تھا باعثِ اعلیٰ صفات میرے لیئے
زباں پہ میری ہمیشہ رہے یہی جاری
میں خود خدا کے لیئے کائنات میرے لیئے

غرض اسلام کا یہ اصول کہ کائنات انسان کے لیئے ہے۔ مادی ترقی اور علومِ جدیدہ اور علمی تحقیقات اور انکشافات کی جد و جہد کی طرف مسلمان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور خود انسان خدا کی عبادت و معرفت کے لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ روحانیت اور مابعد الحیات دائمی زندگی کی طرف رہ نما ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ خلافت و امامت دونوں ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوسکتیں۔

موجودہ دُنیا کی پکار

آج دنیا کی سب سے اہم ضرورت کیا ہے؟ یہی کہ انسان کائنات کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائے اور پھر انسانیت اخلاق خدا ترسی اس کے ساتھ ساتھ ہو۔
یورپ کائنات کی امامت کر رہا ہے۔ لیکن خدا سے باغی ایشیا میں کچھ نہ کچھ خدا اور روحانیت کا چرچا ہے۔ لیکن کائنات اور اس کی اشیاء کو اس نے اپنا امام و خلیفہ بنا لیا ہے۔ کوئی جد و جہد اور حرکت ایشیا میں رہ کر کائنات کے سربستہ رازوں کے آشکارا کرنے۔ اور ان سے فائدہ اٹھانے کی نہیں ہے۔ اس لیئے غلامی اور ذلت اس کے مقدر میں لکھی گئی ہے۔ اگر دنیا اسلام کا پیام کان لگا کر سنتی اور اس پر عمل پیرا ہو جاتی تو یورپ اور ایشیاء دونوں مرض سے نجات پا جاتے۔

دُنیائے اسلام کا فرض

لیکن یہ فرض مسلمان پر عائد ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے عملی نمونہ بن کر پیش ہو اور اسلام کے مذکورہ دو اصولوں کو مضبوطی سے تھام کر خود ہدایت پائے اور دنیا کو نجات دے۔
اسلام کی تعلیم انسانی فطرت کے تقاضوں پر قائم ہے۔ جسمانی اور روحانی۔ دونوں قسم کے فطری تقاضوں

کی رہنمائی اسلامی تعلیم کرتی ہے۔ اور یہ سب خدا کی صفتِ ربوبیت کے تحت ہے۔

ربّ العالمین

وہ خالق اور پیدا کرنے والے تو ہیں ہی لیکن پیدا کرنے کے بعد پرورش کرنا صرف اور صرف انھیں کا کام ہے ان کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ جب انہوں نے انسان کو جسم اور روح کے ساتھ پیدا فرمایا تو جسم اور روح کے تقاضوں اور بھوک کا انصرام بھی فرمایا۔ بقائے جسم کے لیۓ اس کی تہذیب وصفائی اور زینت کے لیۓ اس عالم کو پیدا فرمایا کہ انسان بقائے حیات اور زندگی کی زینت کے سامان مہیّا کرسکے۔

اس کے ساتھ روح کی بھوک اور روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیۓ انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا۔ اور انسان کو عبادت و معرفت کے طریقے بتائے جن پر چل کر انسان آئندہ دائمی زندگی اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی خوشی حاصل کرسکے۔ کیوں؟ ۔ اس لیۓ کہ وہ رب ہیں، پرورش کرنے والے ہیں۔

ماں، باپ خالقِ مجازی ہیں۔ لیکن کیا پیدا کرنے کے بعد ماں باپ پرورش نہیں فرماتے، اولاد کی جسمانی اخلاقی تربیت ان کی فطرت کا تقاضا نہیں ہے۔ جب خالقِ مجازی کا یہ حال ہے تو خدا جو خالقِ حقیقی ہے پیدا کرنے کے بعد تمام عالموں کی پرورش نہ فرماتے، بے شک وہ ربّ العالمین ہیں۔ انھوں نے ایک طرف کائنات اور سورج چاند ہوا وغیرہ پیدا فرماکر انسان کی مادّی ضرورتوں کو پورا کیا تو دوسری طرف رُوح کی بھوک کو انبیاء کرام اور وحی بھیج کر پورا فرمایا گیا۔ ایسا کیوں؟۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رب کے تحت! تو سارے عالم کا راز اس کی صفتِ ربوبیت ہے جو رحمت کے سمندر سے نکلی ہے۔ وہ اللہ رحمٰن ورحیم ہے۔ اور اس رحمتِ بے کنار کے لازمی تقاضے سے رب العالمین ہے۔ انسانی فطرت میں جسمانی اور روحانی دونوں قسم کے تقاضے ہیں۔ اور پھر یہ انسان ایک ہی طاقت اور کیفیت کی جسمانی وروحانی فطرت نہیں رکھتا بلکہ جسمانی اور روحانی تقاضوں کی کمیّت اور کیفیت سے کسی میں کم کسی میں زیادہ، کسی کی فطرت کی پرواز کوتاہ، کسی کی بے حد۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت اور صفتِ ربوبیت نے ہرایک کی جسمانی اور روحانی بھوک کی کیفیت اور کمیّت کے لحاظ سے اور اسی کے مناسب ربوبیت اور پرورش فرمائی ہے۔

انسانی فطرت اور اس کی بھوک اور تقاضوں میں اشتراک کے ساتھ ان کی استعداد کی قوت وضعف، کمی اور زیادتی کی وجہ سے عمومیت کے ساتھ خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن اللہ کی رحمت خواہ عمومیت کے لحاظ سے (رحمٰن) یا خصوصیت کے لحاظ سے (رحیم) ہرطرح پرورش کررہی ہے اور وہ ہرایک کے لیۓ خاص ہو یا عام، کمزور ہو یا قوی، متوسط استعداد کا ہو یا بڑی استعداد کا، وہ سب کے رب ہیں (الحمد للہ ربّ العالمین) اس لیۓ وہ رحمٰن بھی ہیں رحیم بھی، رب العٰلمین بھی۔ انسانی فطرت کی مشترک اور عام مانگ کے لحاظ سے احکامِ شریعت آئے ہیں۔ اس لیۓ شریعت کے احکام سے کوئی بَری نہیں ہوسکتا۔ اس کے احکام کی طلب ہر انسانی فطرت میں مشترک ہے۔ لیکن اس اشتراک کی خاص خاص انسانی فطرتیں روحانی وجسمانی استعداد اور طلب میں دوسروں سے الگ اور بڑھ چڑھ کر بھی ہیں ان کی اس خاص فطرت کی خاص مانگ اللہ تعالیٰ نے پوری فرمائی ہے کہ وہ سب کے رب ہیں لیکن اس خصوصی فطرت اور خصوصی مانگ کے لحاظ سے جو خدائی احکام ہیں وہ سب کے لیۓ نہیں ہیں بلکہ انھیں کی حد تک خاص ہیں جن میں

یہ استعداد پائی جاتی ہے۔ قوی الجسم اور کمزور جسم دونوں کے لئے ایک ہی حکم نہیں ہے۔ مریض اور تندرست احکام میں برابر نہیں ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ انسانی فطرت کی تحلیل وتقسیم فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

۱۔ نوعِ انسانی بوجہے مخلوق شدہ کہ جامع است میانِ قوتِ ملکیّہ وبہیمیّہ و سعادتِ وے در تقویتِ ملکیہ است وشقاوتِ وے در تقویتِ بہیمیّہ۔

۲۔ و بوجہے مخلوق شدہ کہ نفسِ وے رنگہائے اعمال واخلاق قبول کند و در جذرِ خود درآرد وبعدِ موت آں را مستصحب سازد بمثل آنکہ بدنِ وے کیفیاتِ غذا را بری دارد باخود مستصحب می سازد ولہذا تخمہ وحمّیٰ وغیر آں مبتلا می گردد۔

۳۔ و بوجہے مخلوق شدہ کہ می تواند لحوق بخطیرۃ القدّس وتلقّیٔ الہام از آنجا کند وآں چہ در حکم الہام ست از تلقّیٔ سرور وبہجت اگر بہ نسبتِ آں ملائکہ مکرمتے داشتہ باشد وتلقّیٔ ضیق و وحشت اگر بنسبتِ ایشاں منافرتے کسب نمودہ بود۔

(ترجمہ ۱) اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اول انسانی فطرت کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ یہ قوتِ ملکیّہ اور قوّتِ بہیمیّہ دونوں کو جامع ہے اور انسان کی سعادت قوتِ ملکیہ کی تقویت میں ہے اورانسان کی شقاوت قوّتِ بہیمیّہ کو قوی کرنے میں ہے۔

۲۔ انسانی فطرت کچھ اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ جس طرح غذاؤں کا اثر انسان کے جسم تک پہونچتا ہے اور یہ اثر اور کیفیات بعض اوقات مثلاً بخار یا بدہضمی بن کر جسم سے وابستہ ہوجاتے ہیں ٹھیک اسی طرح فطرتِ انسانی اعمال واخلاق کے اثر اور ان کی کیفیات کو قبول کرکے اپنے اندر جذب کرتی رہتی ہے اور نفس کا یہ اثر مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

۳۔ انسانی فطرت خطیرۃ القدس سے جا ملنے کی کوشش کرتی اور اس مقام سے الہام کو حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس الہام کے اثر سے خوشی اور انبساط۔ سرور وبہجت ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس مقام کے فرشتوں سے مناسبت اور انسیت ہوئی ہو۔ ورنہ تو ضیق ووحشت ہوتی ہے۔

شاہ صاحب رح کی اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ انسانی فطرت عام اور مشترک تقاضوں کے ساتھ خاص خاص انسانوں میں خصوصی داعیئے اور خصوصی طلب اور مانگ بھی رکھتی ہے۔ شروع کے دو درجے تمام انسانوں میں عام اور مشترک ہیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) تمام انسان بلا امتیاز ملکیت اور بہیمیت کا مجموعہ ہیں۔ ملکیت روح کا تقاضا ہے اور بہیمیت مادّیت اور حیوانیت کا تقاضا۔ گویا انسانی فطرت میں دونوں قسم کے داعیے موجود ہیں۔ لیکن انسانی سعادت اور فلاح وبہبود اس میں ہے کہ بہیمیت مغلوب ہو اور ملکیت غالب رہے۔ بہیمیت اور اس کے تقاضوں کو جڑسے اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں کہ وہ فطرۃِ انسانی ہیں لیکن ان کا مغلوب اور ماتحت کردینا ممکن ہے اور یہ ہی سعادتِ انسانی کے لیئے ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ربّ ہیں اس لیئے دونوں قسم کے داعیوں کی پرورش کے انھوں نے سامان مہیا فرمائے۔ انسان کی جسمانی مادّی ضرورتوں اور فطری خواہشوں کی بھی یقیناً تکمیل فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اسلام نے فطری قوتوں کے خلاف جنگ نہیں کی۔ بلکہ ان کا صحیح رُخ اور درست حدود متعین فرمائی ہیں اور ازلی ابدی زندگی کی خوشی کے اصول کے لیئے شریعت ایسے طریقے بتاتی ہے جن پر عمل کرنے سے بہیمیت مغلوب اور ملکیت غالب ہو جائے۔

(۲) تمام انسانوں میں عام اور مشترک فطرت یہ ہے کہ فطرتِ انسانی اچھے برُے اعمال اور اخلاق سے رنگین اور مکیّف ہوتی رہتی ہے۔ اور اس طرح نفسِ انسانی اچھے بُرے اعمال و اخلاق کے رنگ قبول کرتا رہتا ہے کہ مرنے کے بعد یہی رنگ روح کا باریک لباس بن جاتا ہے۔ شاید یہ ہی لباس تعین کا درجہ رکھتا ہو۔ ان دو مشترک اور عام فطری خصلتوں کے بعد شاہ صاحبؒ تیسرا داعیہ بیان فرماتے ہیں کہ بعض خاص خاص انسان روزِ ازل سے ہی ایسی فطرت پر مجبور و مفطور پیدا ہوتے ہیں کہ اُن کی فطرت میں عام انسانوں سے الگ یعنی بڑھ چڑھ کر روحانیت کے اعلیٰ مدارج کے حصول کی استعداد ہوتی ہے۔ ان کی روح خدا سے وصال اور اعلیٰ مقامات تک رسائی کی سعی کرتی ہے۔

یہاں تک کہ خطیرۃ القدس سے جاملنے کی کوشش کرتی ہوئی الہام حاصل کرنا چاہتی ہے اور ان مقامات میں کبھی بسط اور کبھی قبض، کبھی سرور و بہیمیت، کبھی ضیق و وحشت کی کیفیات پیش آتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سب کے ربّ ہیں۔ یعنی ضعیف الفطرت اور قوی الفطرت۔ کم درجہ اور اعلیٰ درجہ کی فطرت رکھنے والوں سب ہی کے ربّ ہیں۔ یعنی ربّ العالمین ہیں تمام عالموں کے رب ہیں۔ ادنیٰ متوسط۔ اعلیٰ ہر قسم کی استعداد فطری رکھنے والوں کے ربّ ہیں۔

جب انسانی اعلیٰ قسم کی استعداد رکھنے والی فطرت بارگاہِ ربوبیت سے دریوزہ گری کرتی ہے تو ان کی اعلیٰ بھوک کے لحاظ سے ان کی رحمت و ربوبیت ویسی ہی غذا عطا کرتی ہے۔ ان کی اعلیٰ مانگ اور طلب کو پورا کرتی ہے۔ اس خصوصی فطرت کے لحاظ سے جو احکام ہوتے ہیں وہ سب انسانوں کے لیئے عام نہیں ہوتے بلکہ اس درجے کے لوگوں کے لیئے خاص ہوتے ہیں۔

گویا اولیاء کرام اور اقطاب جو اعلیٰ روحانی استعداد فطرۃً لے کر آتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی ربوبیت ان کے لیئے بھی رہنما ہوتی ہے۔ ان کے لیئے بھی احکام ہوتے ہیں۔ یہ بھی شریعت کا ایک جزء ہیں لیکن ایسی اور اس قدر قابلیت واستعداد رکھنے والوں کی حد تک محدود۔ ہر ایک کے لیئے بلا استثناء نہیں۔

اسی لیئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مقاماتِ تصوّف میں فنا بقا انسلاخ واستہلاک کی ہر ایک کو دعوت دینا سخت ظلم ہے۔

حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

فنا و بقا و استہلاک دغیر اینہا مطلوب اند باعتبار خصوصیت افراد زیراکہ بعض نفوس در غایت علوّ وتجرّد مخلوق می شوند۔ خدائے تعالیٰ اینہا را برائے ایشاں دلالت می فرماید دآں حکم نوامیس نیست بلکہ لسانِ حالِ این فرد از جہتِ خصوصیتِ فردیّت تقاضائے آں کردہ۔

فنا و بقا۔ استہلاک وانسلاخ افرادِ انسانی کی خصوصیت کے لحاظ سے مقصود ہیں نہ کہ عام افرادِ انسانی کے لیئے کیونکہ تمام انسان روحانیت اور تجرّد کی اعلیٰ قابلیت پر پیدا نہیں ہوتے۔ اس لیئے خداوند تعالیٰ ایسے

لوگوں کو اُن کی فطری راہ سے ہدایت فرماتے ہیں۔
آگے حضرت شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔
وبالجملہ افراط در مقدمات انسلاخ واستہلاک ومشغول شدن ہرکس وناکس بآں دابِ عُضال امت و در ملتِ مصطفویہ خدا رحم کند کسے راکہ سعی در اخمالِ آنہا کند۔
خلاصہ یہ کہ انسلاخ اور استہلاک کے ذریعوں میں ہرکس وناکس کا منہمک اور مشغول ہوجانا ملتِ مصطفویہ کے لیئے دردناک ہے۔ خدائے رحیم وکریم اس پر فضل کرے۔ جو طریق شاہ راہِ عام سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے (کہ یہ انسانوں کی خاص فطرت ہی کے لحاظ سے درست ہے)۔
اس کے بعد حضرت شاہ صاحب جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں اسے غور سے سنیئے:۔
ہرچند ایں سخن بر بسیارے از صوفیائے زماں دشوار خواہد بُود۔ امّا مرا کارے فرمودہ اند برحسب آں می گویم با زید وعمر کارے نیست۔
اگرچہ اس زمانے کے بہت سے صوفیار کو میرا یہ کلام سخت ناگوار گذرے گا۔ لیکن مجھکو زید وعمر سے کچھ کام نہیں ہے۔ مجھے جس کا حکم کیا گیا ہے اسی کے موافق کہتا ہوں۔
شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا بیان سے حسب ذیل نتائج اخذ کیئے جا سکتے ہیں:۔
(۱) اول یہ کہ شریعت تمام انسانوں کی فطرت کے لحاظ سے بلا استثنار مقصود اسلام ہے۔
(۲) دوسرے یہ کہ تصوف کے اعلیٰ مدارج کے احکام بلا استثنار سب انسانوں کے لیئے نہیں ہیں۔ بلکہ خاص خاص انسانی فطرتوں کے لیئے ہیں۔ اور صوفیائے زمانہ کا ہرکس وناکس کو بلا ان کی فطری استعداد اور شخصی روحانی طلب کو معلوم کیئے مقامات استہلاک وانسلاخ جیسے اعلیٰ مقامات میں مشغول کرادینا امتِ محمدیہ کے لیئے سخت دردناک ہے۔
شاہ صاحب رح کا یہ بیان انسانی فطرت کے کس قدر مطابق ہے۔ اس کا فیصلہ آپ خود ہی کرسکتے ہیں۔ اور ملّتِ اسلام میں اس شاہراہِ حق سے عدول کرکے جن بزرگوں نے قدم رکھا ہے اس کے نتائج مسلمانوں اور اسلام کے لیئے کس قدر تباہ کن نکلے ہیں۔
تصوّف کے اعلیٰ مقامات کا ثبوت کسی نہ کسی طرح قرآن واحادیث سے ثابت ہے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان کے بعد حضرت قاضی ثنار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث سے جن مقامات تصوف .... کو ثابت کیا ہے۔ وہ اپنے مقام پر بالکل حق اور درست ہیں۔
لیکن حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم سے جن کو مناسبت ہے وہ جانتے ہیں کہ شاہ صاحب نے سخت سے سخت الجھے ہوئے مقامات کو بھی اس طرح حل فرمایا ہے کہ جہاں شریعت، طریقت، معرفت، سب فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ قرآن اور احادیث کی جن آیتوں اور حدیثوں سے تصوف کے اعلیٰ مقامات کا ثبوت ملتا ہے وہ اپنے خاص محل و موقف کے لحاظ سے شرعی حیثیت اختیار کرجاتے ہیں اور اسلام ہی کا جزر ہیں۔
سوال صرف احکام شریعت کو محل اور بے محل چسپاں کرنے کا ہے اور یہی وہ مقام ہے جس کو فراموش

کرنے سے اسلام میں ہزار در ہزار فرقے پیدا ہوگئے۔ اور ہر ایک اپنا مطلب قرآن و احادیث سے نکالتا ہے۔ لیکن کون سی آیت اور کون سی حدیث کس مقام اور کس محل اور کن حالات کے لیئے ہے اس کا تجزیہ ہی ہم کو راہِ حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس کے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام ہیں۔ اسلام اور اس کی تعلیم کو انسانی فطرت سے مطابق اور ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

غرض باری تعالیٰ کی ربوبیت نے بنی نوع انسان کی عام اور مشترک طلب اور پیاس کو بھی کماحقہٗ فرو کیا ہے اور شریعت انھیں احکامِ خداوندی کا نام ہے۔ اور فطرتِ انسانی کے نقطۂ نظر سے یہ ہی شریعت مقصود بھی ہے اور ان احکام سے انسانوں کا کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہے کہ یہ ہر ایک انسان کی مشترک طلب کا انصرام ہے۔ لیکن ربوبیتِ الٰہیہ یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس اشتراک کے ساتھ ساتھ جن انسانوں کی فطرت غایت تجرّد اور انتہائی عُلو کے مقام میں پیدا کی گئی ہے۔ اور وہ الہام اور احکامِ الہام کی پیاس اور تقاضا رکھتی ہے۔

ان کی رہ نمائی اور تربیت بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت نے فرمائی ہے۔ قرآن اور احادیث میں ان کی تربیت کے سامان بھی موجود ہیں۔ ان کی ہدایت و رہنمائی کے احکام بھی قرآن و احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بلا استثناء تمام نوعِ انسانی کے لیئے نہیں ہیں۔ بلکہ خاص فطرت پر محمول۔ اعلیٰ تقاضے رکھنے والی انسانی فطرت کے لیئے ہیں۔

یہ مطالبِ صوفیہ غیر مقصود نہیں بلکہ شریعت کے احکام کی طرح مقصود و مطلوب ہیں لیکن فرق اس قدر ہے کہ تمام انسانوں کے لیئے مقصود و مطلوب نہیں ہیں بلکہ اُن خاص فطرت رکھنے والے انسانوں کے لیئے مقصود و مطلوب ہیں جن میں اس کی ایسی اعلیٰ استعداد و قابلیت پائی جاتی ہو۔

آج اگر صوفیاء اس نکتہ کو سمجھ کر قدم بڑھائیں تو امتِ مسلمہ کی ہزاروں خرابیوں کا علاج ہو سکتا ہے اور مسندِ ارشاد و ہدایت پر صرف وہی انسان متمکن ہو سکتے ہیں جن میں اس راہ کی مکمل صلاحیتیں ہوں اور جن کو اللہ تعالیٰ اس راہ میں حکمت سے بھی سرفراز فرماتا ہے۔ اعلیٰ مضامینِ تصوّف اور مقاماتِ وحدت الوجود کی ہر کس و ناکس کو تلقین کرنا اور ہر ایک کو بلا استثناء اس کی دعوت و تبلیغ اسلام میں ایک فتنہ بن جاتی ہے (باقی باقی)

"مولانا حفظ الرحمٰن رح" بقیہ صفحہ ۱۶)

بھگتنی پڑی۔ مولانا رہا ہو کر اگرچہ اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہے مگر خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند کی مذہبی سیاسی اور اصلاحی تحریکات میں برابر شرکت کرتے رہے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھیں دارالعلوم ہی میں استاد مقرر کردیا گیا مگر اس ذمہ داری کے باوجود سیاست میں برابر حصہ لیتے رہے۔

۱۹۱۹ء سے جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس مرکزیہ کے رکن اور ۱۹۴۲ء سے ناظمِ اعلیٰ رہے۔ آپ کئی برس تک کانگریس کمیٹی کی ایگزیکٹو کے رکن بھی رہے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی ان کے فکر و قلم نے بعض بڑے اہم موضوعات پر اپنی بہترین یادگاریں قصص القرآن۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق اور رسول کریم ؐ کی شکل میں چھوڑی ہیں۔

قابلِ قدر رسائل

الاستبصار فی فضل الاستغفار جس میں دعاء کے فضائل اور اس کی تاثیر کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کی دعائیں یکجا کی گئی ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی رح کا شہرۂ آفاق رسالہ ہے جو علماء اور عوام دونوں کے لیے یکساں مفید ہے خصوصاً تبلیغی حلقوں میں بے حد مقبول ہے۔ مصیبتوں اور بلاؤں سے بچنے کے لیے اس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ اعلیٰ کتابت وطباعت کے ساتھ، ہدیہ چالیس پیسے۔

اغلاط العوام عوام میں پھیلی ہوئی بے پناہ گمراہیوں اور رسومات کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح نے یکجا جمع کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ سب خرافات ہیں اور اسلام کو ان رسومات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بدعتی ماحول سے بچنے کے لیے ایک اچھا کتابچہ ہے۔ قیمت صرف چالیس پیسے۔

ڈاڑھی کا فلسفہ مکمل اس کتاب کو تصنیف فرماکر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح نے پوری قوم پر احسانِ عظیم فرمایا ہے اور لاکھوں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو گمراہی سے بچاکر صراطِ مستقیم کی تعلیم دی ہے۔ اس مختصر سے کتابچہ میں ڈاڑھی کی شرعی حیثیت۔ اسلام میں ڈاڑھی کی اہمیت، اور پوری مسلم قوم کے لیے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی ضرورت پر کلام کیا گیا ہے۔ پوری کتاب عقلی دلائل اور مشاہدے وتجربے کے ساتھ تحریر ہے۔ عقائد سے ہٹ کر ہر تعلیم یافتہ ذی شعور کے لیے ایک دعوت بھی ہے اور عبرت بھی۔ اب تک یہ کتابچہ نامکمل چھپتا رہا ہے۔ ادارے نے پوری محنت کے ساتھ مکمل شکل میں شائع کیا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ ہدیہ چالیس پیسے

طریقہ مولود شریف اسلام میں مولود شریف کی حقیقت اور اس کے انعقاد کی شرطیں نہایت سہل اور صاف زبان میں حضرت مولانا تھانوی رح کی زبانِ قلم سے سنیے۔ یہ ردّ بدعت میں ایک موثر اور کامیاب ترین کتابچہ ہے کتابت، طباعت اور کاغذ سب عمدہ۔ ٹائیٹل سفید آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ ہدیہ چالیس پیسے۔

حفظ الایمان حضرت مولانا تھانوی رح نے ردّ بدعت کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ رسالہ بھی ردّ بدعت کے سلسلے میں تحریر کیا گیا ہے جس میں علمِ غیب، غیر اللہ کے لیے سجدہ۔ قبروں کا طواف۔ قبروں پر بوسہ، قبروں پر سجدے اور ان سے متعلق پھیلی ہوئی جملہ رسومات اور بدعات کی حقیقت پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے۔ قابلِ مطالعہ رسالہ ہے۔ مکتبہ نے اپنی روش کے مطابق نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ہدیہ چالیس نئے پیسے۔

فضائل دعاء دُعاء اور اس کے فضائل پر ایک بصیرت افروز کتاب ہے۔ جناب حاجی نصیر الدین صاحب اکبر آبادی کی یہ تالیف دُعاء اور اس کی حقیقت، دُعاء اور اس کی قسمیں، دعاء مانگنے کا طریقہ وغیرہ پر ایک اچھا مواد پیش کرتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔

یہ کتابیں اور ہر قسم کی علمی، دینی اور مذہبی وتاریخی کتابیں، قاعدے، پارے، قرآن مجید وغیرہ

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ "مشرب" دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)**

مولانا حفظ الرحمٰن رح

کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی
(فاضل دیوبند)

اس احساس سے ہی کلیجہ کٹا جاتا ہے کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رح اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ وہ عظیم رہنما جس نے پورے تینتالیس سال تک ملک و ملت کی رہبری کے فرض کو بحسن وخوبی انجام دیا آج وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔ مولانا رح کی وفات مسلمانوں کے لیے غیر معمولی حادثہ اور ملک وقوم کا عظیم تر نقصان ہے۔ ایک ایسا نقصان جس کی تلافی کی مستقبل قریب میں بظاہر کوئی امید نہیں۔ مولانا رح کا انتقال ایک ایسے ادارے کا انتقال ہے جو بہت سے اوصاف کا حامل تھا وہ صرف مسلم قوم کے ہی رہبر نہ تھے بلکہ پورے ملک کے رہبر تھے وہ صرف ممتاز عالم بیباک مقرر اور بڑے سیاست داں ہی نہ تھے بلکہ ان کی ذات میں دیگر حمیدہ خصائل موجود تھے وہ ہندوستان کے دل کی دھڑکن اور اس کی روح تھے یہی وجہ ہے کہ آج جبکہ ان کا ضعیف جسم سرد ہوکر خاکِ وطن کی آرام دہ آغوش میں پہنچ چکا ہے ہم میں سے ہر ایک اس بات کا احساس کرنے پر مجبور ہے کہ ہم سے ایک متاعِ گراں مایہ چھن گئی۔ یہ احساس ہر لیڈر کی موت پر نہیں ہوا کرتا ہے۔ یہ احساس ایک تو مولانا آزاد رح اور مولانا حسین احمد مدنی رح کی وفات پر ہوا تھا اور آج ان مرحومین کے دیرینہ رفیق مولانا حفظ الرحمٰن رح کی وفات پر ہوا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کی جدید تاریخ کے معمار تھے اور ایسے مجاہد تھے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف ہوکر رہ گیا تھا۔ جنگِ آزادی کی تحریک کو انہوں نے صرف اپنا لہو ہی نہیں دیا تھا بلکہ سارے ولولے نذر کردیئے تھے ایک ایسے خطرناک وقت میں جبکہ قوم پرستی جرم عظیم سے کم نہیں تھی اس کا پرچم بلند کیے رہے آزادی سے پہلے مولانا رح علماء کی ایک جماعت کی رفاقت میں قومی تحریک کی لڑائیاں لڑتے رہے لیکن آزادی کے بعد بھی انھیں سکون کے لمحات میسّر نہ آسکے ملک کی آزادی اپنے ساتھ خونریزی اور نفرت انگیزی بھی لیتی آئی ان تمام کا مقابلہ بڑے استقلال اور پامردی کے ساتھ کرتے رہے۔ ان کی صحت نے بارہا ان کی رفاقت سے انکار کیا لیکن مولانا ہار ماننے والوں میں سے نہ تھے ان کے کمزور اور ضعیف جسم میں جہد وعمل کی ایسی چنگاریاں موجود تھیں جن سے جدوجہد کا جذبہ ابھرتا ہے ملک آزاد ہوا تو مولانا کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں آزادی کے آغاز میں تقسیم کے تلخ نقوش مٹانے اور مسلمانوں کو سنبھالے رکھنے کا دشوار ترین کام تھا اور اس کے بعد ان کی مشکلات اور مطالبات کے حل ڈھونڈھنے کا مرحلہ تھا ایک طوفانی دور گذرنے پر دوسرا طوفانی دور اس طرح آتا رہا کہ مولانا کو سانس لینے کا موقع بھی نہ مل سکا اور وہ اپنی صحت کی طرف سے بے پروا جہد وعمل کا چراغ لیئے ہوئے ان دشوار راہوں سے گذرتے ہی رہے۔

۱۹۴۷ء دہلی کے مسلمانوں کے لیے ۱۸۵۷ء سے اپنی ہولناکی کے اعتبار سے کم نہیں تھا۔ اس ہولناک اور خطرناک زمانہ میں تنہا مولانا رح کی ذات تھی جو مسلمانوں کے لیے سپر بنی ہوئی تھی۔ اس خطرناک وقت میں مولانا نے دہلی کے مسلمانوں کی ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ ان کا اندازہ مستقبل کا مؤرخ ہی لگا سکے گا۔ مولانا کی خدمات کی وسعت دہلی تک محدود نہ تھی بلکہ وہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے کام آتے تھے اور جسقدر اور جہانتک

ہو سکتا تھا وہ بلا تفریق ہر مسلمان کی مشکلات دور کرنے کی سعی کرتے تھے۔ اس مہلک اور جان لیوا بیماری کے دوران بھی مولانا چین سے نہیں بیٹھے۔ امریکہ سے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ سی۔ بی گپتا کے نام انہوں نے جو خط سّہ لسانی فارمولے کے سلسلے میں روانہ کیا تھا اس سے ایک نظر میں یہ احساس ہوجاتا ہے کہ مولانا اپنے دل میں قوم کا کس قدر درد رکھتے تھے وہ قوم کی ہمدردی اور اس کے درد کو دور کرنے کی ہر آن فکر میں رہتے تھے اور اس مشغولیت میں اپنی بیماری کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

مولانا رح درحقیقت سچے قوم پرور اور ملک کے بہی خواہ تھے اسی بنا پر جب جبل پور و ساگر اور دیگر مقامات پر فرقہ پرستوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا تو وہ چلا اٹھے۔ وہ جس نے وطن کی آزادی کی خاطر اپنی جوانی نذر کردی تھی۔ آزاد دیش میں مسلمانوں کے ساتھ اس وحشیانہ رویہ کو کس طرح برداشت کرسکتا تھا وہ گرجا اور اس طرح گرجا کہ اس نے سرکاری افسروں، وزراء حکومت اور فرقہ پرستوں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔

مسلم کنونشن پچھلے سال جون میں دہلی میں بلایا تھا اس کنونشن کی بناء پر مولانا کو کانگریس اور سرکاری حلقوں کے علاوہ مسلمانوں کے بعض حلقوں کے اختلاف کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ مسلم کنونشن کے بعد مولانا نے جب پورے ملک کا دورہ کیا تو اپنی تقریروں کے اندر کنونشن کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی تھی اور آئندہ کا خاکہ بھی پیش کرتے تھے افسوس کہ اس دورے کے کچھ روز بعد ہی مولانا پر کینسر کا حملہ ہوگیا اور مولانا نے کام کا جو نقشہ بنایا تھا وہ ادھورا رہ گیا۔

آج جبکہ ملک، وقوم اور مسلمانوں کو مولانا رح جیسے دلیر بےباک سچے اور خیر خواہ لیڈروں کی سخت ضرورت ہے ان کے انتقال کو آسانی سے برداشت کرنا مشکل ہے لیکن قدرت کے فیصلے کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے آج ہم اس عظیم رہ نما کی وفات پر سوگوار روحوں کے ساتھ ان کی بے مثال زندگی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور ان کی اس بیباکی کو سلام کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات نے انھیں عطاء کی تھی۔ مولانا رح کی وفات سے مسلم قیادت میں ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کا جلد پُر ہونا ممکن نہیں۔ مولانا پر مسلم قیادت کا ایک دور ختم ہوگیا۔ اللہ سے دعاء ہے کہ مولانا کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہمیشہ ہمیشہ ان کی قبر پر بارشِ رحمت ہوتی رہے۔

مختصر حالاتِ زندگی

مولانا ۱۹۰۱ء میں ضلع بجنور کے ایک قصبہ سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی شمس الدین صاحب تھا ابتدائی تعلیم سیوہارہ ہی میں رہ کر حاصل کی اس کے بعد علوم مشرقیہ کی مزید اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخل کیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ یورپ میں جنگِ عظیم شروع ہوچکی تھی اور اکابر علمائے دیوبند کی انقلابی تحریک کو اگرچہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مگر برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کے جراثیم صرف موجود ہی نہیں تھے بلکہ اپنا کام بدستور کر رہے تھے۔ مولانا نے بھی اس اثر کو قبول کیا اور ۱۹۲۰ء میں رولٹ کمیٹی کی سفارشوں سے اختلاف کرتے ہوئے جب اہل ہند نے بالاتفاق اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو مولانا اگرچہ اس وقت طالب علم تھے مگر انہوں نے اس تحریک میں حصہ لیا اور اس کے نتیجہ میں مولانا رح کو ایک سال کے لیے سزائے قید دیا گیا

فخرِ انور شاہؒ، نازشِ دارالعلوم

مولانا
سید محمد انظر شاہ کشمیری

بڑی مشہور بات ہے، جس میں شائبہ کسی خلافِ واقعہ چیز کا نہیں، ایک بدیہی امر ہے، جس میں قیل و قال کی گنجائش کہاں؟ بنی انسان خمیر اسی جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، حیوان کا ان چار چیزوں سے ہے۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا۔ لیکن ان چاروں عناصر کے اثرات یکساں نہیں، کسی میں خصوصیت مٹی کی غالب، تو کسی میں مائیت کا غلبہ، کوئی سراپا آتش تو کسی کو ہوائے محض پایا۔ لیکن ایک بس ایک چاروں سے مرکب، اور چاروں کا مظہرِ اتم، حفظ الرحمٰن اول بھی اور آخر بھی۔

آتشِ سوزاں، لیکن باطل کے لیئے، پانی سے زیادہ شیریں اور خوشگوار، حق کے روبرو۔ ہواؤں سے زیادہ نرم و نازک اپنوں اور غیروں کے حق میں۔ مٹی سے زیادہ سرنگوں، دشمنوں کے سامنے بھی اور دوستوں کے لیئے بھی: کبھی آگ کی طرح بھڑکتا اور شعلہ بار تقریروں سے باطل کے پرخچے اُڑاتا۔ پانی کی طرح بہتا تو حق کی آبیاری ادھر سے اُدھر تک ہوجاتی۔ نسیمِ سحر کی طرح چلتا تو مسرت و بہجت کے غنچے اور شگوفے کھل جاتے۔ اور سب کچھ ہونے کے باوصف مٹی کی طرح، فروتنی کا مظہر، تواضع کا پیکر۔ وہ آتشِ نمرود نہیں تھا جس میں امام حق سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جلا کر خاک کرنے کی تجویز ہو۔ وہ پانی کا سیلِ عرم نہیں تھا جو ظالم اور مظلوم کا فرق بھول جائے وہ طوفانی ہواؤں کا جھکڑ نہیں تھا جو گلزاروں اور سدا بہار باغوں کو اجاڑ دے، وہ مٹی کا اٹھتا ہوا ایسا بگولہ نہیں تھا جس سے چشم بینا دھندلی اور تاریک ہوجائے۔ اس کی آتش بیانی باطل کے لیئے تھی، اس کی پانی جیسی خصوصیت حق کے لیئے، وہ بادِ بہاری چمنستان سچائی و صداقت کے لیئے اس کی فروتنی و تواضع حق و صداقت سامنے تھی، وہ ریشم سے زیادہ نرم۔ حریر سے بڑھکر نازک، لوہے سے زیادہ سخت، پانی سے بڑھکر مواج، بجلیوں سے کچھ آگے بیتاب۔ سیماب سے بے چینی و بیقراری میں بڑھا ہوا متحرک، مجاہد، عالم، فہیم، ذکی، ذہین ایک بے پناہ اوصاف کی شخصیت۔

حفظ الرحمٰن کیا تھا۔ دو سو سالہ علماء دیوبند کی تاریخ تابناک تاریخ کی آخری لڑی۔ آہ اے ظالم موت، کس سرمایہ کو لوٹا، کس متاع کو چھینا، کون شخصیت اٹھی، کیسا آفتاب غروب ہوا۔ کون سی شفق خون آلود ہوئی ملت کی چشمِ اشکبار، شاید اب خونیں آنسو، .... اس اندوہناک حادثہ پر ہمیشہ بہاتی رہے گی، اس کی یاد ستائے گی، وہ ہر مرحلہ پر یاد آئے گا ہر منزل اس کی منتظر ہوگی، ہر راہ، ہر موڑ، ہر گام ہر قدم اس کی راہ دیکھے گا۔ مگر جانے والا اب وہاں جا پہونچا جہاں سے مڑ کر اس دنیا کو دیکھنا، جھانکنا ممکن نہیں۔

آہ اے حفظ الرحمٰن! چند یادیں، چند باتیں ذہن میں اس مردِ مجاہد کے متعلق موجود ہیں، غم کو ہلکا کرنے کے لیئے اپنا اور آپ کا۔ کچھ عرض ہیں کچھ کسی اور وقت کے لیئے امانت۔

استقامت

مجاہدِ ملت کی زندگی میں سب سے نمایاں وصف، سب سے زیادہ جاذبِ نظر خصوصیت، ان کی بے نظیر استقامت

اور بے مثل استقلال تھا۔ آج سے تینتالیس سال پہلے سوچ سمجھ کر، سیاسی مسلک جو انھوں نے اپنے لیئے پسند کیا تھا، بہت سے نشیب و فراز آئے، انقلابات نے کروٹیں بدلیں، حوادث نے رُخ دکھائے، طوفان اُٹھے، جھکڑ چلے، مخالفت الامان و الحفیظ۔ گالیاں۔ بُرا بھلا، بے عزتی، رسوائی، بدنامی، قید و بند، مصائب و مشکلات، سب ہی کچھ ہوا، اپنوں کی طرف سے بھی اور بیگانوں کی جانب سے بھی۔ لیکن حفظ الرحمٰن، چٹان کی طرح نہیں بلکہ ایک پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما رہا۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور جس میں مسلم لیگ کی ایک خاص سیاست ہندوستان میں ایک ایسا مدوجزر پیدا کر چکی تھی جس کے نتیجہ میں قوم پرور حلقے، مسلمانوں کی نظریں نہ صرف مشکوک بلکہ ملامت وطعن کے تیروں کے سب سے بڑا نشانہ بنے ہوئے تھے یہی زمانہ تھا جب کہ بہت سوں کے پائے استقامت میں لغزش پیدا ہوئی، آج داؤد غزنوی کانگریس سے گئے اور کل افتخار الدین، صبح نواب اسماعیل نے خیرباد کہی تو شام کو چودھری خلیق الزماں نے، یہاں یہ شخصیت ڈوبی، وہاں وہ ستارہ ٹوٹا۔ لیکن ان سب میں حالات سب کچھ سننے کے باوجود سب کچھ سہتے ہوئے ایک ہی شخصیت تھی جو اپنی راہ پر قائم، اپنی منزل کی تلاش میں قافلہ سالار کی حیثیت سے چل رہی تھی۔

مولانا مرحوم نے جو مسلک سیاسی اختیار کیا تھا وہ اس پر کسی ضد، ہٹ دھرمی اور بات کی پچ کی وجہ سے قائم نہیں تھے بلکہ وہ دو اور دو چار کی طرح یہ بات بالکل صحیح سمجھتے تھے کہ ہندی مسلمان کے لیئے یہی راہ ہے اور یہی منزل، وہ جانتے تھے کہ اگر آج نہیں تو آنے والی کل میں ان کی رائے کی اصابت تسلیم کر لی جائے گی۔

سنگین حالات کا مقابلہ

یہی بے نظیر استقامت تھی جس نے ان کے اندر خوفناک اور سنگین سے سنگین حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کر دی تھی وہ اس حوصلہ سے خوفناک اور دہشت انگیز احوال کا مقابلہ کرتے جو ان کا مخصوص حصہ نظر آتا۔ بھلا سوچیئے تو سہی کہ ۱۹۴۷ء میں جب بربریت وظلم، ستم و عدوان، درندگی و حیوانیت کا لاوا ملک میں پھوٹ پڑا۔ اور آزادی کی صبح اپنے جلو میں کھلتے ہوئے پھولوں، ہنستے ہوئے غنچوں کے بجائے، چیخ و پکار، آہ و بکا، گریہ و شیون سسکتی ہوئی آہیں، کراہتی ہوئی آوازیں، تڑپتے ہوئے لاشے۔ لٹے ہوئے خاندان۔ پٹے ہوئے انسان، بیوہ عورتیں، یتیم بچے، خالی ہاتھ۔ ماں باپ کا روتا ہوا۔ چلاتا ہوا، چیختا ہوا۔ کراہتا ہوا قافلہ لے کر آئی تو ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے، بڑے بڑے بہادر، بہت سے شجاع، مسلمانوں کے سب سے بڑے ہمدرد، اور ہندوستان میں ہلاکو و چنگیز کی تاریخ کے دہرانے کے دعوے دار، ایک ایک کرکے پاکستان کا رخ کر رہے تھے اور جو ہندوستان ہی ایک دو رہ بھی گئے تو وہ عافیت اسی میں سمجھتے کہ یہاں کے ظلم کو انصاف، عدوان کو رحمت اور فرقہ پرستی کو انسانیت نوازی ثابت کرتے رہیں، ایک ہی تھا جو ان خونیں حالات میں اپنی جگہ کھڑا رہا، نہ اس کے قدم کپکپائے نہ وہ گھبرایا، نہ حالات کی سنگینی اس کو سہما سکی، نہ جاں گسل گھڑیاں اس کو مرعوب کرسکیں۔ اس نے دہلی میں بیٹھ کر خون کی ندیوں کے رخ بدل دیئے۔ اس نے ظالموں کے ہاتھ سے تلوار چھین لی، وہ مسلمانوں کی لاشوں پر تنہا رویا اس نے گھروں کی حفاظت کی اس نے عصمت وعفت کی پہرہ داری کی، وہ بیواؤں کا سہارا بنا، یتیموں کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ ہر ایک کا مددگار، سب کا غم کھانے والا، سب کی خدمت کرنے والا، سب کے لئے اچھا اور سب کا دوست ثابت ہوا۔

دہلی کے خونین ہنگامے میں مولانا کی یہی جلیل القدر اور مجاہدانہ خدمات تھیں جن کو دیکھکر احرار مرحوم کے ایک مرحوم قائد نے کہا تھا کہ :۔

”دہلی میں جو کچھ مولانا حفظ الرحمٰن نے مسلمانوں کی خدمت کی ہیں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا!“

اس جملے کی قدر اس وقت معلوم ہوگی جبکہ یہ بھی آپ جانتے ہوں کہ یہ مرحوم راہنما آخر میں جمعیۃ العلماء سے شدید نظریاتی اختلاف کی بناء پر نہ صرف یہ کہ جمعیۃ سے علیٰحدہ ہوچکے تھے بلکہ ایک حد تک، مخالفت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکے تھے۔ بہرحال اب تو دونوں ہی حضرات اس عالم میں پہونچ چکے۔ جہاں سب کچھ کیا کرایا سب کے سامنے ہوگا، پھر ان مجاہدانہ کارناموں کا دامن ۱۹۴۷ء سے پھیل کر ۱۹۶۲ء تک کھنچ گیا تھا۔ اس دور میں، ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مسلمانوں کا ظالمانہ قتل، غارت گری، لوٹ مار، فتنہ وفساد۔ کبھی مبارک پور میں خونریز ہنگامہ، گاہے سرزمین بھوپال، مسلمانوں کے خون سے داغدار۔ صبح جبلپور میں صبح قیامت، شام علی گڑھ میں شام غربت۔ ستامڑھی۔ بہار، میرٹھ چندوسی، مرادآباد اور خدا جانے کہاں کہاں ہنگامے خون ریز فساد، لیکن ان سب ہنگاموں کے فراست وفہم، تدبیر و تدبر، سوجھ بوجھ، اور پامردی واستقلال سے مقابلہ میں بس ایک ہی شخصیت جمی رہی اور وہ تھی تنہا حفظ الرحمٰن کی!۔

۱۹۴۷ء کے بعد احساس کمتری کے جس دستِ آہنیں میں مسلمان پھنس گئے تھے جس کے نتیجے میں ان کی سیاسی موت ہوچکی تھی۔ اُن کی ہمتوں پر اوس، ان کے عزائم پر مردنی چھارہی تھی، ان حالات میں منتشر شیرازہ کو سمیٹنا، مسلمانوں کو جانا، ان کو بٹھانا اور پھر ان کو یہ سمجھانا کہ مسلمان اور بزدلی دو مختلف چیزیں ہیں جو قیامت تک جمع نہیں ہوسکتیں، اور اس طرح ان میں فرقہ واریت کے خونیں دیوتا کے مقابلہ کی توانائی پیدا کرنا اور آخرکار مسلم کنونشن کے انعقاد پر ملی وقومی زندگی کا ایک کامل ثبوت بہم پہونچانا، ان کارناموں کو دیانتدار طبقہ مولانا کی مجاہدانہ اسپرٹ کا ایک لازوال نقش سمجھ چکا ہے اور غیر منصف حلقے بھی آج نہیں تو کل اس حقیقت کے قائل ہوکر رہیں گے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کا واحد ذمہ دار صرف حفظ الرحمٰن تھا۔

وفادار انسان

ہندو فرقہ پرستی کے خلاف پورا محاذ قائم کرنے والا یہ مردِ مجاہد اگر ایک طرف ہندوستان میں ہونیوالے مظالم پر چیختا اور چلاتا۔ اور ہندوستان کے آئین کے تحت یہاں کی اکثریت سے اقلیت کے جائز حقوق کا مطالبہ کرتا تو دوسری جانب ملک اس کی روایات، اس کے تحفظ، اس کے دفاع۔ ملک کی سب سے بڑی جماعت کانگریس سے اس کی وفاداری بھی بے مثل تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ملک کو برطانوی استبداد سے جس طرح کانگریس نے آزادی دلائی اسی طرح اس ملک میں فرقہ واریت کے جنون کا مقابلہ بھی اس جماعت کے صحیح الدماغ افراد ہی کرسکتے ہیں۔ اس لیے وہ کانگریس کو سپورٹ کرنے اور انفرادی و اجتماعی طاقت سے اس کی قوت عملی کا اضافہ، اپنا ایک سیاسی فرض سمجھتے تھے وہ مسلمانوں کو ہمیشہ یہی مشورہ دیتے رہے کہ ملک میں نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کانگریس کی طاقت کو بڑھانا ازبس ضروری ہے۔ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نئے حالات میں جمعیۃ العلماء نے جس طرح مسلمانوں کی خدمت اور تحفظ کی ذمہ داریاں مجاہد ملت کی زیر قیادت انجام دیں اس سے زیادہ صحیح راہ نہ کوئی تھی اور نہ ہوسکتی ہے۔ مرحوم کی اصابت رائے اور سیاسی مسلک پر ان کا اعتدال، انشاءاللہ بہت جلد اپنا

لوہا سب سے منوائے گا۔

بہرحال اس عنوان کے تحت مولانا کی ذہنیت کا صحیح منظر سامنے لانے کے لیئے ایک واقعہ اب بھی سن لیجئے:

"غالباً دو ڈھائی سال پرے کی بات ہے، وہ رات کو مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں بیٹھے ہوئے تھے اور کافی افراد نے اُن کو گھیر رکھا تھا، سلسلۂ گفتگو دراز ہوا تو کسی شخص نے کانگریسی جھنڈے سے متعلق بحث شروع کر دی۔ اس متوازن عقل و فراست کے انسان یعنی مرحوم مولانا حفظ الرحمٰن نے مذہبی تمام نزاکتوں کا پورا خیال رکھتے ہوئے قومی جماعت کے اس ترنگے جھنڈے کی عظمت سے متعلق وہ رائے ظاہر کی جس کو سن کر سب حیران و ششدر رہ گئے"

بس یہی ان کا توازنِ فکر ورائے تھا جو ان کو سب سے ممتاز اور جدا کرتا، نہ وہ خالی کانگریس مین تھے جن کی نظر میں کانگریس کا ہر صحیح اور غلط اقدام درست ہو، نہ وہ ایسے مفاد پرست آدمی تھے جو مذہب کے تقاضوں کو بے تکلف اپنی مصالح کے نظر کر دیتے اور نہ وہ اتنے زود رنج تھے کہ کانگریس کی تمام سرد مہریوں سے تنگ آکر اس جماعت کے صحیح نظریات و افکار سے بھی بغاوت کا اعلان کر دیتے۔ مذہب کی تمام ہدایات کو اپنی جگہ پوری طرح باقی رکھتے ہوئے مسلک، قومی جماعت، یہاں کے مصالح کی رعایت، ان کا ایسا مسلک اور متوازن راہِ عمل تھی جس پر خال ہی خال افراد ان کی نظیر میں پیش کیئے جا سکتے ہیں۔

جرأت و عزیمت

کیونکہ وہ اپنی پوری زندگی میں کسی بھی جہت اور گوشہ سے کوئی ایسی خامی نہیں رکھتے تھے کہ ان پر حرف گیری کی جا سکے وہ جو کچھ دیکھتے اس کو بے تکلف کہتے جو کچھ نظر آتا، زبان پر لانے میں کبھی تامل نہ کرتے، حق کو حق، باطل کو باطل، اندھیرے کو اندھیرا۔ اور اجالے کو اُجالا قرار دیتے۔ ان کی صاف گوئی حیرت انگیز تھی۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک ارباب حل و عقد پر جس طرح کھل کر انہوں نے تنقید کی، حکومت کو جس طرح بار بار جھنجھوڑا۔ ہندو فرقہ پرستی پر جیسی کڑی تنقید کرتے رہے ان کا وہ مخصوص حصہ تھا جس کو انہوں نے خود ہی پیدا کیا تھا اور اپنے ساتھ ہی ختم کر دیا۔

یہاں تک کہ ان کی اس جرأت مندانہ روش سے آزردہ ہو کر بعض ان کے دوست اور قدرداں حلقے بھی ان پر اعتراض و ملامت کی زبان کھولنے لگے تھے۔ چنانچہ پچھلے دنوں میرٹھ کے ہنگاموں پر جو کچھ انہوں نے کہا اس پر چراغ پا یوپی کے ایک ذمہ دار وزیر نے تو جمعیۃ ہی کو جلی کٹی سنانا شروع کر دی تھیں۔ لیکن کسی کی ناراضگی کسی کی برہمی کسی کے غصہ اور کسی کے رنجیدہ و کبیدہ ہونے سے وہ کب مرعوب ہوئے بلکہ ذاتی مفاد اور مصالح کے شدید نقصان کے باوجود حق کا اظہار کرنے سے وہ کبھی نہیں چوکتے تھے آج یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی خدمت وہ اس بیگری سے نہ کرتے جس کی تاریخ وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں تو کانگریس کی صدارت سے لے کر، کسی بھی مرکزی منسٹری کے عہدہ پر ان کا فائز ہونا نہ صرف ممکن بلکہ متوقع تھا۔ وہ خود بھی جانتے اور سمجھتے تھے کہ ہواؤں کا رخ کس طرف ہے اور یقیناً وہ اپنے قرب وجوار میں ان شرمناک آوازوں کو بھی سن رہے تھے جو ملّی اور قومی مفادات کو ہڑپ کر کے صرف اپنی دنیا بنانے کے لیئے اٹھتی رہتی تھیں اور پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کس طرح ان خدمات کے صلہ میں

اقتدار ان قوم فروشوں کے لیے چشم براہ ہے۔ تاہم سب کچھ دیکھنے کے باوجود حفظ الرحمٰن نے نہ ایک لمحہ کے لیے سکوت اختیار کیا، نہ مذہب سے بغاوت کی، نہ قومی مفادات کو پسِ پشت ڈالا اور نہ مسلمانوں کے لاشے پر اپنے اقتدار کی عمارت کھڑی کی، وہ بڑے سے بڑے عہدہ دار کو اس کی مجرمانہ غفلت پر جس طرح خطاب کرتے، وہ ان کی جرأت وعزیمت کا ایک ایسا شاہکار ہوتا جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے عاجز رہے گی۔

رواداری

مگر اس شدید تنقید وگرفت کے باوجود رواداری کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے مخالف کے لیے بھی ان کا سینہ کھلا ہوا تھا اور ان کی امداد و تعاون کا دستِ کرم کشادہ تھا۔ اپنے شدید بداندیش کے لیے بھی کبھی کوئی غلط بات سوچنا تو درکنار سننا بھی گوارا نہ کرتے۔

دہلی کے ایک .... روزنامہ کے ایڈیٹر کا جب کسی نے ان کے سامنے ناگوار لب ولہجہ میں ذکر بھی کردیا تو ان کی خوشنودیٔ طبع تو بے چارہ ذکر کرنے والا کیا حاصل کرتا۔ اُلٹے وہ سخت ڈانٹ سننا پڑتی جس کے بعد ہمیشہ کے لیے اس طرح کی باتیں حفظ الرحمٰن کے سامنے نہ کرنے کا عزم لے کر مجلس سے اٹھنا پڑتا۔

مسلم لیگ کے "شبابِ جنونی" دور میں دہلی مسلم لیگ کے صدر نے بلیماران میں ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے اس نے وہ ہتک آمیز معاملہ کیا جو ایک شریف انسان کسی کٹر دشمن کے لیے بھی روا نہیں رکھ سکتا۔ واقعہ کا اتنا حصہ دیدہ ہے۔ جب حالات نے کروٹ بدلی تو یہی صاحب پاکستان کے لیے پر تول رہے تھے اور دہلی سے بحفاظت وہاں ان کو نکالنے کی تمام کوششیں یہی مظلوم حفظ الرحمٰن انجام دے رہا تھا۔ قصہ کا یہ آخری جزو شنیدہ ہے اور جن سے سنا ان کی دیانت وراستگوئی پر پورا اعتماد۔

فہم وذہن رسا

ان کی تربیت خالص ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس کو صدیوں سے روشن دماغ بدنام کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کوئی .... نااہلی، انگھڑپن ایسا نہیں جس کو ان بے چارے مظلوم طبقہ "مولوی" کے ذمہ نہ تھوپ دیا جاتا ہو، لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ انہی بدنام اور مشکوک طبقہ کا ایک فرد یعنی حفظ الرحمٰن اپنی سوجھ بوجھ، سمجھ وفراست، معاملہ رسی اور ذکاوت، حاضر دماغی، حاضر جوابی، گہرے تدبر اور گہری سیاست کے اعتبار سے سب پر بھاری تھا وہ سیاسی جوڑ کو اس طرح سمجھتے کہ اس کے سیاسی توڑ میں ان کی فنی مہارت اپنی داد لیے بغیر نہ رہتی، کیا مجال کہ کوئی لفظوں کے ایر پھیر، یا تعبیرات کے گورکھ دھندوں میں الجھا کر ان کو بات کی تہہ تک نہ پہونچنے دے۔ ادھر منہ سے بات نکلی، متدار متکلم کی زبان پر اور ترکھٹ سے حفظ الرحمٰن کے دماغ میں۔ یہ تمام معاملہ اس سرعت کے ساتھ صورت پذیر ہوتا کہ بجلی کی برقی رَو بھی اس تیز رفتاری کا مقابلہ نہ کرسکتی ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ از راہِ مروت کبھی چپ ہو رہتے تھے لیکن اس خاموشی کو اس پر محمول کرنا کہ حفظ الرحمٰن معاملہ نہیں سمجھ سکا قطعًا غلط تھا۔ ہر شخص کے بارے میں ان کی ایسی جچی تلی رائے تھی کہ وہ اس آدمی کے مزاج وکوائف کی صحیح ترجمان ہوتی ہم سمجھتے کہ مولانا اس سے غافل ہیں۔ لیکن اگر کبھی کسی خاص فرد کے متعلق

اپنی رائے کا اظہار کرتے تو معلوم ہوتا کہ افراد و رجال سے متعلق ان کا مطالعہ کتنا عمیق، کیسا درست اور کس قدر صائب ہے۔ بعض سادہ لوح ایسے موقعہ پر جب وہ مروت سے کام لیتے تو سمجھتے کہ ہم نے فریب میں اس زکی کو مبتلا کردیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی کہ یہ صاحب خود ہی فریب میں مبتلا ہوتے۔

معاملہ کی تہہ تک پہونچ جانا اور منٹوں میں الجھے ہوئے مسائل اور مشکلات کو حل کر دینا یہ ان کی خصوصیت ہر موقع پر نظر آتی۔ بڑے بڑے چابکدست سوچ سمجھ کر دلائل کا پشتارہ کسی خاص مسئلہ پر لے کر آتے، چرب زبانی نہیں بلکہ مضبوط دلائل، سلیقہ اور پوری منطقی ترتیب کے ساتھ اپنے نظریات پیش کرتے ادھر حفظ الرحمٰن کی وقار طبیعت حرکت میں آئی اور سارے دلائل ایک لمحہ میں تار و پود ان کا بکھیر دیا۔ جب بات مرصع انداز میں پیش کی جاتی تو معلوم ہوتا تھا کہ یہی صائب فیصلہ ہے لیکن جب مجاہد ملت کی تقریر ہوتی تو نظر آتا کہ مقرر نے جو کچھ سمجھا اور سمجھایا تھا وہ سب کچھ غلط تھا۔

سحر آفریں خطابت

یہ واقعہ ہے کہ اس خاص جزو میں وہ اپنی سحر آفریں خطابت سے کام لیتے۔ یعنی مسائل کو دھکیلنے کی طاقت جہاں ان کو اپنی فہم و ذکا سے حاصل ہوتی تھی اس طاقت کی کمک، خطابت اور بے مثال قوت بیانیہ سے انھوں نے پائی تھی۔ لاکھوں کے مجمع کو مسحور کر لینا ان کا ادنیٰ کام تھا بلکہ باتوں کو کانوں کی راہ سے دماغ اور دماغ سے دلوں میں پیوست کرنا ان کی خطابت کا اہم عنصر تھا۔ پرجوش خطیب، باہوش مقرر، سحر البیان۔ فصیح و بلیغ اور کامیاب خطابت ان کا امتیاز تھا، آواز بلند، مترنم، باتیں دلنشین، انداز رسیلا۔ شوکت الفاظ۔ شوکت لہجہ۔ ترکیب کا در وبست۔ منطقی ترتیب، سائنٹفک اندازِ بیان، اب کس کس کا مرثیہ لکھیئے۔ خدا جانے، جوانی کی تقریریں کس درجہ حدت لیے ہوئے ہوں گی کہ بڑھاپے کی خطابت میں بھی شباب کی گرمی کم نہیں زیادہ ہی موجود تھی بولنے کے بہت عادی تھے بلکہ بعض اوقات غیر ضروری باتوں کا سلسلہ بھی دراز ہوتا تاہم ان کی ایک عجیب خصوصیت تھی کہ بلا غور و فکر بولنے کے باوجود کبھی کوئی غلط یا خلافِ مصلحت بات ان کی زبان پر نہ آتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا دماغ ہر وقت ان کی زبان کی طرح کام میں لگا رہتا ہے۔ مسائل کا حل فکر و نظر کے بعد نہیں بلکہ کسی ادنیٰ غور و فکر کے بغیر وہ ڈھونڈھ نکالتے۔ حاضر جوابی تو اس بلا کی تھی کہ خاص اس وصف میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ سینکڑوں کو مختلف جواب دینا۔ فوراً دینا اور پھر ہر ایک کو مطمئن کر دینا انھیں کا کام تھا۔

بامروّت انسان

مروت و وفا ان کا ایک ایسا وصف تھا جو ان کی پوری زندگی پر حاوی بلکہ کہنا چاہیئے کہ دوسرے اوصاف اس ایک وصف کے سامنے مغلوب نظر آتے۔ وہ ہر شخص کے ساتھ وفا و مروت سے پیش آتے یہی وجہ تھی کہ ان کے متعلقین، تو درکنار غیر تک، نجی معاملات میں ان کو شریک رکھتے اور وہ پوری دیانت کے ساتھ صحیح مشورہ دیتے اور صحیح فیصلہ کرتے، ان کو اپنی درسگاہ دارالعلوم سے عشق اور اس کے مفادات و مصالح سے وارفتگی کا جذبہ تھا ہر موقع اور ہر مرحلہ پر اس عظیم درسگاہ کے لیئے جاں سپاری کے جذبہ سے سرشار رہتے۔

گذشتہ سال کچھ بیرونی سازشوں کے نتیجہ میں جب دارالعلوم میں ایک خوفناک اسٹرائک کا سلسلہ شروع

ہو گیا تو ان کا دارالعلوم کے لیئے بے تاب و بے چین ہونا، قابلِ دید تھا، اور بلاشبہ اپنی اس وفاداری کا صلہ انہوں نے نہ غیروں سے حاصل کیا اور نہ اپنے ہی ان خدمات کو دل سے سراہ سکے، لیکن حفظ الرحمٰن کسی بھی صلہ کا کبھی محتاج نہ رہا۔

وفا و مروت کی بات تھی کہ وہ نہ صرف اپنے اساتذہ بلکہ ان کے متعلقین کے لیئے بھی ہمیشہ ایک ایسی مروت اور وفا کا مظاہرہ کرتے رہتے جو تلامذہ کی تاریخ میں اگر نادر نہیں تو عجیب یقیناً ہے۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے چالیس سال قبل، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مرحوم کے صاحبزادے ہونے کی حیثیت سے جو روابط انہوں نے قائم کیئے تھے چالیس سال کی طویل زندگی میں، شکست وریخت ان تعلقات کی تو درکنار، کبھی اس استوار رشتہ مودت ویگانگت میں اضمحلال بھی پیدا نہ ہوا۔ اس خوشگوار تعلق کی داستان تو "مفتی صاحب" ہی کا قلم سنائے گا۔ اس سلسلہ میں جو ذاتی تجربہ ہے۔ اس کے کچھ قصے آپ بھی سن لیجیئے۔

برادرِ محترم مولانا ازہر شاہ قیصر اور خاکسار سے بالکل اس طرح کا معاملہ کرتے جیسا کہ شفیق بھائی کا اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ۔ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم کے ساتھ موجودہ زندگی میں مرحوم کے تعاون و امداد کو بڑا دخل تھا۔ ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال، ہر معاملہ میں شرکت، ہر مشکل میں ساتھی، ہر رنج کے شریک، اور ہر خوشی پر خوش ہونے والے۔ جب کبھی جو بات کہدی خواہ کتنا غلط مطالبہ کیوں نہ ہوا۔ کیا مجال کہ اس کو پورا نہ کریں۔ ہماری ہر مصلحت پر اس طرح نظر رکھتے کہ شاید ہم خود بھی اس دور اندیشی سے کام لینے سے عاجز ہیں۔ ہر طرح کی مدافعت، سب طرف سے دفاع۔ "نقش" نکلا تو اتفاقاً انھیں دنوں کسی صوبائی جمعیۃ العلماء کی طرف سے کوئی غیر ذمہ دارانہ بیان بھی آ گیا تھا۔ جائزہ کے عنوان کے تحت اسی بیان پر مدیر نقش ہی کے قلم سے کچھ الفاظ نکل گئے۔ مخالفین نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ وہ جمعیۃ العلماء کے عاشق، ایک تیز و تند مکتوب مدیر نقش کے نام آ پہونچا۔ بچپن کی بات کسی معذرت کے بجائے خط و کتابت کا سلسلہ راقم السطور کی طرف سے بھی شروع ہو گیا، لیکن اس تمام کشمکش میں عام و خاص سے بھی کہتے رہے کہ (یہ نوٹ انظر کا لکھا ہوا نہیں ہے)۔ ہائے اب اس محبت کا انسان کہاں سے میسّر آئے گا۔ ہر موقع پر یوں ہی جواب کی تلقین کرتے اور نازک سے نازک مواقع پر اسی طرح ان کی امداد ہمارے شاملِ حال رہتی۔ اس عنوان کے تحت سینکڑوں ہی واقعات لکھے جا سکتے ہیں لیکن وہ ہماری محبت میں وہ کچھ بھی کر جاتے جس کو ایک "راز" ہی رہنا چاہیئے اس لیئے ان کی روحِ پاک کے سامنے ممنونیت کے ساتھ سر جھکائے ہوئے قلم اس عنوان پر کچھ لکھنے سے انکار کرتا ہے۔

اپنے استاذ حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے شدید اور گہرے تعلق کا یہ عالم تھا کہ پچھلے سال کشمیر گئے تو وزیر اعظم کشمیر سے خصوصی انتظام کرا کر واتو استاذ رح کے مکان پر پہونچے، مدّت کے بعد بخشی صاحب حیرت کے ساتھ کہتے تھے کہ (اس دور میں ابھی ایسے تلامذہ موجود ہیں جو اساتذہ کے گھروں کی زیارت کے لیئے دور دراز کا سفر کر کے پہونچیں)

حضرت شاہ صاحب مرحوم کا تذکرہ بہت کم کرتے اور یہ ان کی عادت تھی۔ ان کا تعلق دل میں رہتا۔ زبان پر ظاہر کرنے کے لیئے مصنوعی انداز سے وہ کبھی کام نہ لیتے۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی اس مقدس رشتہ

کا تذکرہ چل نکلتا، تو بڑی محویت واستغراق کے عالم میں کچھ سنا دیتے۔ دیوبند آتے تو بلاناغہ حضرت الاستاذ کے مزار پر حاضری اور ان کے مکان پر تشریف آوری۔ والدہ محترمہ کو "بُوا" کے پیارے لفظ سے یاد کرتے۔ بلکہ دیوبند میں حضرت شاہ صاحب مرحوم کے ایک ایک متعلق سے ملاقات اپنا فریضہ سمجھتے۔ بولنے میں کیونکہ بہت بے باک تھے۔ اس لئے سنا ہے کہ مرحوم استاذ کی مجلس میں بھی زناٹے کی تقریروں سے نہ رکتے۔ تاہم کیونکہ ان کی سرشت احترام واکرامِ اساتذہ سے پوری طرح بہرہ ور تھی اس لئے کبھی کبھی استاذ کو ناراضگی تو کیا سوءظنی بھی نہ ہوئی لیکن اس تمام تعلق، پورے احسانات کے باوجود نہ تعریف کے کلمات سنتے اور نہ مشکوریت وممنونیت کا اظہار ہونے دیتے۔ اگر کبھی دو چار لفظ شکریہ کے کسی موقعہ پر یا تعریف کے ان سے متعلق کہہ بھی دیئے تو ان کا موڈ اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا۔ بے نیازی کے ساتھ چہرہ پھیر لیتے اور سنی ان سنی ایک کر دیتے۔

کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لئے کسی بھی ستائش ونیائش کا خود کو مستحق نہیں جانتے تھے بہرحال علیم وبصیر ان کو اس عالم میں ان تمام کرمفرمائیوں کا بہترین صلہ عنایت فرمائے جو "اہلِ بیتِ انور" کے ساتھ ان کی مخصوص تھیں۔

حق گوئی

بڑے حق گو، اور حق پسند تھے، سیاسی نظریات میں مولانا آزاد مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کے بڑی حد تک مقلد ہونے کے باوجود علمی مسائل میں ان کی تحقیقات پر ہرگز اعتماد نہیں کرتے تھے۔ قصص القرآن کے صفحات شاہد ہیں کہ مرحوم مولانا آزاد کے بہت سے انکارات پر "تاویل باطل" کے عنوانات حفظ الرحمن ہی کے قلم نے لگائے ہیں یہ ان کی ایک ایسی خصوصیت تھی کہ ایک سیاسی طرز کے انسان میں خاص اس وصف کا فقدان ہی رہتا ہے۔ اگرچہ مدت سے سیاسی مشاغل علمی دلچسپیوں پر غالب آچکے تھے لیکن کیونکہ زمانہ طالبعلمی میں انہوں نے فخر روزگار اساتذہ کی زیرتربیت اپنی استعدادِ علمی ہموار کی تھی اور بعد میں ایک زمانہ تک درس وتدریس کے شغل کے ساتھ عمیق اور گہرے مطالعہ کا موقع ملتا رہا اس لئے ٹھوس قابلیت اور بہترین علمی حذاقت رکھتے تھے۔ تصانیف خصوصًا قصص القرآن ان کی علمی دستگاہ ودسترس کا ایک مکمل ثبوت ہے۔

حُسنِ صُورت

اچھے اور ستودہ اخلاق کے ساتھ خدا تعالیٰ نے چہرہ مہرہ بھی بڑا جاذب نظر عنایت فرمایا تھا۔ کشیدہ قامت، چھریرا بدن، لمبے لمبے ہاتھ، اور پاؤں، لمبا چہرہ، بڑی اور منور آنکھیں۔ گھنی لیکن خوبصورت ڈاڑھی، موزوں قامت، متوازن جسم، پھرتیلا انسان، بھویں اور سر کے بال مدت سے سفید ہو چکے تھے، یہ سفیدی حوادث وتجربات کی بخشی ہوئی تھی جس کی روشنی میں وہ دھندلکوں کو دور کرنے کے عادی تھے بولتے تھے بہت تیز بلکہ دوسروں کو بولنے کا موقع کچھ کم ہی دیتے۔ جاذب اور پرکشش شخصیت ہونے کے باوجود مرعوب کن چہرہ مہرہ تھا۔ ہنستے کم لیکن دلچسپ لطائف اور قصے کبھی سنتے اور سناتے، دوستوں اور بے تکلف احباب سے سنجیدہ مذاق کرنے کے عادی تھے اس راقم السطور سے خصوصًا بہت بے تکلف تھے جب ملتے تو سنجیدہ، گفتگو کم، دلچسپ اور پرشفقت باتیں زیادہ

فرماتے رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

ایک ہی شخصیت

یہ واقعہ ہے اور اس کو ماننا پڑے گا کہ ان کی اپنی ساری تعمیر خدا تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد خود اپنی صلاحیت ہنرمندی اور ذاتی جدوجہد کا نتیجہ تھی نہ وہ کسی خانقاہ نشین شیخ کی اولاد میں سے تھے، جن کو گدی، کسی بھی صلاحیت کے بغیر حاصل ہوگئی ہو، نہ وہ کسی علمی با اثر اور بارسوخ باپ کے بیٹے تھے جس کی بنی بنائی اثر واقتدار کی عمارت ان کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ انھوں نے سب کچھ خود کیا تھا وہ اپنی شخصیت کے معمار خود ہی تھے بلکہ شخصیت ساز تھے، ہزاروں کو انسان بناگئے، جس درسگاہ میں پہونچے اس کے لیئے باعثِ فخر بنے جن اساتذہ سے پڑھا ان کا نام روشن کردیا، جس جماعت سے وابستہ رہے اس کا تعارف خود رہے۔

آج سے تقریبًا بارہ سال پہلے دارالعلوم دیوبند میں ایک جلسہ کسی خاص موقع پر ان کے استقبال کے سلسلہ میں طلبہ کی طرف سے ہوا تھا۔ بچھراؤں ضلع مرادآباد کے ایک طالب علم نے ان کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ پڑھا وہ خود جلسہ میں موجود تھے۔ ایک مصرع اسی قصیدہ کا تھا ع

فخرِ انور شاہ نازشِ دارالعلوم

واقعہ یہی ہے کہ ان کی تربیت میں ان دو کو بڑا دخل تھا۔ ایک دارالعلوم اور دوسرے ان کے استاذ امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ۔ اور پھر شاعر کے کہنے کے مطابق وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے واقعۃً انورشاہ کے لیئے فخر اور دارالعلوم کے لیئے باعثِ نازش تھے۔ خاکسار نے اسی لیئے اس مقالہ کا عنوان بھی یہی رکھا۔

وہ جمعیۃ کے حلقوں میں محبوبیت اور مقبولیت کے اعتبار سے کانگریس میں جو حیثیت جواہرلال کی ہے رکھتے فہم وتدبر میں مولانا آزاد کی بے تکلف نظیر تھے۔ اور صلاحیتِ کار مرحوم رفیع احمد قدوائی سے ملتی جلتی۔

غالبًا ۱۹۰۱ء میں سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۶۲ء میں دہلی میں انتقال فرمایا۔ عجیب بات یہ ہے کہ عمر اور وفات کے مہینہ میں اپنے استاذ علامہ کشمیری سے اتحاد بھی حاصل ہوا۔ وہ آج درمیان میں نہیں لیکن ان کی صدا اب بھی سنی جاسکتی ہے۔ وہ منزل چھوڑ گئے مسافر انھیں خطوط پر چل کر اپنا سفر پورا کرسکتے ہیں۔

انھوں نے دین۔ علم، عمل، سیاست اخلاق، معاملات۔ عزیمت واستقلال اشجاعت واستقامت، سچی سیاست اور صداقت پسندانہ طرزِ عمل، میں ایک راہ بنائی تھی اور وہ کھلی ہوئی ہے بعد میں آنے والے اس پر چل سکتے ہیں لیکن ان کی نظیر۔ ان کی مثال، ان کا مثل اب کیا عرض کروں۔ سنا ہے کہ غالب کا یہ شعر تکرار اور تغیر لہجہ سے دو مختلف معنی دیتا ہے۔ ایک حریف نے مردافگن کی تلاش اور پھر اس جستجو پر ناکامی وحسرت کا اعلان اسی شعر کو ان کی وفات پر آج آپ بھی سن لیجئے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مشرب دیوبند، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶۲ء

تاریخِ وفات

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

از:- مولانا محمد جمیل الرحمٰن صاحب سیوہاروی رکن دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

حفظِ رحمٰن یعنی وہ ملّت پناہ ۔۔۔ آسمانِ ہند کے رخشندہ ماہ

کل وہ صد افسوس رخصت ہو گئے ۔۔۔ آہ کیسا دن تھا وہ روزِ سیاہ

قلب ان کی یاد میں بے چین ہے ۔۔۔ ڈھونڈھتی ہے ہر طرف ان کو نگاہ

الفراق، اے حفظِ رحمٰن، الفراق ۔۔۔ تیری فرقت ہے قیامت آہ آہ

یاد آتی ہیں وہ تیری مجلسیں ۔۔۔ تھا مسلسل جن میں شورِ واہ واہ

یاد آتی ہے تری مشغولیت ۔۔۔ خدمتِ مخلوق میں شام و پگاہ

یاد آتی ہیں وہ تقریریں تری ۔۔۔ اور وہ تحسینِ اہلِ جلسہ گاہ

یاد آتی ہے تری فکرِ سلیم ۔۔۔ قوم کے حق میں ہوئی جو شمعِ راہ

وہ مجاہد وہ نثارِ شمعِ حق ۔۔۔ جن کی جاں بازی کی ہر خلقت گواہ

تھے جو مظلوموں کی ڈھارس کا سبب ۔۔۔ بے کسوں کو جن سے ملتی تھی پناہ

کیا کہوں وہ کون تھے، کیا چیز تھے؟ ۔۔۔ پیکرِ اخلاص تھے بے اشتباہ

جسم وقفِ خدمتِ خلقِ خدا ۔۔۔ اور دل مصروفِ ذکرِ لا اِلٰہ

ہاتفِ غیبی نے فرمایا لکھو ۔۔۔ چل بسے ملت کے وہ پشت و پناہ

۸۲ ھ ۱۳

مجاہد ملتؒ کی ایک تاریخی تقریر

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص کو اگر قوتِ تحریر کی دولت سے وافر حصہ عطا کیا جاتا ہے تو وہ قوتِ تقریر کی نعمت سے محروم رہتا ہے لیکن مولانا ان چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جنھیں اللہ دونوں نعمتوں سے نوازتا ہے۔ مولانا ایک طرف بیباک، صاف گو اور شعلہ بیان خطیب تھے اور دوسری طرف مصنف اور مؤلف کی حیثیت سے بھی انفرادی شان کے مالک تھے۔ ذیل میں مولاناؒ کی ایک تاریخی اور معرکۃ الآراء تقریر پیش کی جارہی ہے۔ یہ تاریخی تقریر ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء کو پارلیمنٹ میں کیگئی تھی۔

(ادارہ)

دلیل کی جگہ جذبات

یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے یہ ڈھنگ اختیار کرلیا ہے کہ ایسے معاملات جن کو پارلیمنٹری اصولوں پر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ قوتِ دلیل سے سمجھانا چاہیئے ان مسائل کو مشتعل جذبات کے ساتھ نہایت مکروہ رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری باتوں میں کوئی دلیل نہیں اور گمراہ کن جذبات کے سوائے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ان مسائل کے دوسرے پہلو اور دوسرے رخ کو پیش کرنے کے لیئے دوسروں کو مرعوب کرنے کا ڈھنگ یہ نکالا ہے کہ فوراً ہی پاکستان، مسٹر جناح اور مسلم لیگ تین بھوت سامنے کھڑے کردیئے جائیں گویا دوسرا کوئی شخص اگر ٹنڈن جی یا سیٹھ گووند داس کے خلاف بولنا چاہے تو وہ مرعوب ہوکر بولنے کی جرأت ہی نہ کرسکے۔

اسپیکر صاحب! میں آج اس گمراہ کن طرزِ عمل کے خلاف پُرزور احتجاج کرنے اور یہ بتانے کے لیۓ کھڑا ہوا ہوں کہ حق کی آواز کو ٹنڈن جی کا یہ طریقہ کار ہرگز نہیں دبا سکتا اور ایک منٹ کے لیۓ بھی ہم کو مرعوب نہیں کرسکتا

ہم مرعوب نہیں ہوسکتے!

ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہوسکتے ہیں اور نہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے نام سے اس لیۓ کہ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو اور دوسرے چوٹی کے قوم پرور لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے اور ہم پر اس قسم کے گمراہ کن مرعوب کرنے والے الفاظ کا رتی برابر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔

اُردو کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو تسلیم کرلینے کے باوجود کہ ہندی راشٹریہ بھاشا ہے اور پورے ملک کی سرکاری زبان تسلیم کرلی گئی ہے۔ آیا اُردو زبان کو یا دوسری علاقائی زبانوں کو اس ملک میں پھلنے پھولنے کا حق ہے یا نہیں۔

اس میں مطلق دو رائیں نہیں ہیں کہ ہم سب یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو جو اسی ملک کی پیدا وار ہے اور ہندو مسلمانوں کے باہمی پریم ساگر کا ایک بہترین نشان ہے۔ اس کو بھی تعلیمی اداروں اور سرکاری عدالتوں میں سرکاری حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔

جو لوگ اُردو کو پاکستان کے ساتھ جوڑتے ہیں جیساکہ ٹنڈن جی کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے یا جو اس کو انگریزی کی طرح دیس نکالا دینا چاہتے ہیں جیساکہ سیٹھ گووند داس کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے یہ دونوں اس ملک میں نہیں ہونے دی جائیں گی۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور ان کی پوری مخالفت کی جائے گی۔

شری ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اردو کے خلاف یہ کہہ کر کہ ہم اردو کے مخالف نہیں ہیں زہر اگلنا اور خواہ مخواہ بیچ میں اسلامی تمدن اور ہندو تمدن کی بحثیں لانا اور پاکستان کی آڑ میں ایسی باتیں کہنا جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہیں ناقابلِ برداشت ہیں اور کوئی خود دار اور محبِ وطن اس گمراہ کن طریقے کو برداشت نہیں کرسکتا۔

ٹنڈن جی کے غلط الزام کی تردید

ٹنڈن جی کا یہ فرمانا کہ یوپی میں جو تحریک اردو کے بارے میں چلائی جارہی ہے۔ وہ بھارتی کلچر کے خلاف فرقہ پرستی کی تحریک ہے اور دوسرے پاکستان یا دوسرے مسلم لیگی نظریئے کو زندہ کرنا ہے۔ میرے نزدیک ہی نہیں بلکہ پورے ہاؤس کے نزدیک اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ میں ٹنڈن جی اور سیٹھ جی دونوں سے گذارش کروں گا کہ اردو کی تحریک کو جس طرح ہم چلارہے ہیں وہ صرف مسلمانوں کی نہیں ہے۔ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور یوپی کے بسنے والے ہر آدمی کی جو اردو سے تعلق رکھتا ہے ملی جلی تحریک ہے۔ اس لیئے یا تو ٹنڈن جی اور سیٹھ جی فرقہ پرستی کے مفہوم سے واقف نہیں ہیں یا جان بوجھ کر غلط الزام لگانا چاہتے ہیں۔ اس لیئے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کی تحریک جو یوپی میں چلائی گئی ہے اس کی مخالفت کرنے والا خود فرقہ پرست ہے اور ملک کے آئین کا بہت بڑا مخالف اور دشمن ہے۔

پاکستان کس نے بنوایا؟ مجرم کون ہیں؟

ہم کو مرعوب کرنے کے لیئے بار بار پاکستان مسلم لیگ اور مسٹر جناح کا نام نہ لیا جایا کرے۔ یہ توہین آمیز طریقہ ایک منٹ کے لیئے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیئے کہ پاکستان اُردو نے نہیں بنوایا بلکہ سیاسی بے ایمانیوں اور دلوں کے کھوٹ، تنگ نظری اور تنگ دلی نے اس کو چار چاند لگائے ہیں۔ اگر مسٹر جناح اس کے مجرم ہیں تو وہ لوگ بھی ان سے کم مجرم نہیں جن کے دلوں کا کھوٹ، تنگ نظری اور تنگ دلی آج بھی نہیں جاتی۔ ہمیں پاکستان کا طعنہ

کیا دیا جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب یہ مسئلہ کانگرس کے اجلاس میں زیر بحث آیا تھا تو اس وقت لیڈروں کی تقریر کے بعد پہلا شخص میں تھا جس نے پورے زور کے ساتھ یہ کہا تھا کہ بزدلانہ طریقہ پر انگریز کی کرائی ہوئی تقسیم کو قبول نہیں کرنا چاہیئے۔اور تحریکِ آزادی کو آگے بڑھا کر اپنی قوت سے ملک کو آزاد کرانا چاہیئے۔آج اس بزدلی اور کھوٹ کو اُردو کی مخالفت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز نے اسی لیئے یکپر وائز کیا کہ وہ ایک ٹکڑے کے ذریعہ دوسرے حصّہ کو ہمیشہ خوف وہراس میں مبتلا رکھے اور کبھی سچا پریم ومحبت پیدا نہ ہونے دے۔

سب سے زیادہ لچریات

سیٹھ گووند داس کا یہ فرمانا کہ اگر آج اتر پردیش میں اُردو کی تحریک کامیاب ہوئی تو کل یہی آواز ہمارے مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت اور دوسری مختلف ریاستوں سے اُٹھے گی اور اس طرح بیسیوں پاکستان بن جائیں گے میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان کا یہ بھوت سیٹھ جی کو کیوں اس درجہ پریشان کیئے ہوئے ہے۔اگر آئین کے مطابق بہار، مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت اور دوسری ریاستوں میں ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی اُردو بولنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ثابت ہو جائے جس کی بنا پر اُردو کو سرکاری طور پر تعلیمی اداروں اور سرکاری عدالتوں میں سہولتیں حاصل ہوں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔کیا علاقائی زبانوں سے پاکستان بن جایا کرتے ہیں؟۔ اتنی لچریات شاید اس ہاؤس میں کبھی نہیں کہی گئی ہوگی۔

دلوں کا چور فرقہ پرستی کی جڑ

ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس جی کو یہ سخت صدمہ گذرا ہے کہ وزارتِ تعلیم نے شبلی اکیڈیمی۔انجمن ترقی اُردو اور جامعہ ملیہ کو گرانٹیں کیوں دی ہیں۔اس سے ان کے نزدیک بھارتیہ کلچر کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا بلکہ ان کے الفاظ میں فرقہ پرستی کو فائدہ پہنچتا ہے۔میں اس انتہائی افسوسناک ذہنیت پر انتہائی اظہارِ افسوس کرتے ہوئے گذارش کروں گا کہ دلوں کا یہی چھپا ہوا چور ہے جو دراصل ملک میں فرقہ پرستی پیدا کر رہا ہے اور سچا پریم پیدا نہیں ہونے دیتا۔جب بار بار کہا جا چکا ہے کہ ہندی سرکاری زبان ہے تو اس کے جس قدر بھی اداروں کو مدد دے کر قوت پہنچائی جائے۔ہمیں اس کی خوشی ہے اور ہم اس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔مرکزی وزارتِ تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی لچر اور پوچ باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نہ صرف اُردو کو بلکہ دوسری تمام علاقائی زبانوں کو بھی جو اپنی ترقی کی کوشاں ہیں پوری پوری مدد کرنے اور اس طرح ملک کی ہر علاقائی زبان اور ثانوی سرکاری زبانوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع بہم پہونچائے۔

ٹنڈن جی کو چیلنج۔ ہر فرقہ کا تمدن زندہ رہے گا

میں ٹنڈن جی کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر یہاں مسلمان موجود ہیں تو اسلامی تمدن، اگر ہندو ہیں تو ہندو تمدن،

اگر سکھ عیسائی موجود ہیں تو سکھ عیسائی تمدن سب زندہ رہیں گے اور کوئی طاقت ان تمدنوں کو مٹا نہیں سکتی۔ اگر ٹنڈن جی اسلامی تمدن نہیں چاہتے تو یہ ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا اگر انھیں ہندو تمدن نہیں چاہیئے تو وہ بھی ان پر زبردستی لادا نہیں جا سکتا۔

بھارتی تمدن کیا ہے؟

کیا ٹنڈن جی بتا سکتے ہیں کہ کس چیز کا نام انھوں نے بھارتیہ سنسکرتی رکھا ہے؟ کیا وہ یکبارگی ہی آکاش سے پھٹ کر آ پڑی تھی یا دھرتی سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اسلامی تمدن، ہندو سکھ اور عیسائی تمدن سبھی نے اپنی امتیازی حیثیت باقی رکھتے ہوئے مل جل کر جو مشترکہ تمدن بنایا ہے۔ وہ بھارتیہ تمدن یا سنسکرتی کہلا سکتا ہے اور جس طرح باغ میں گلاب چنبیلی، چمپا اور جوہی اپنی بہار دکھاتے ہوئے گلدستہ کی نمائش بنتے ہیں۔ اسی طرح یہ تمام تمدن اپنی اپنی جگہ زندہ اور مضبوط رہتے ہوئے ہندوستان کے مشترک تمدن کا گلدستہ بناتے ہیں۔ پس جو لوگ اُردو زبان کے خلاف یا تمدن کی بحث اٹھا کر پاکستان کا غلط حوالہ دے کر گمراہ کن جذبات ابھارتے ہیں۔ میں ان کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ایوان بھی اس بارے میں میرا پورا پورا ساتھ دے۔

وزارتِ تعلیم سے شکایت

مجھے تو مرکزی وزارتِ تعلیم سے یہ شکایت ہے کہ صوبائی وزرائے تعلیم کی میٹنگ میں جس کی صدارت مرکزی وزیر تعلیم نے کی تھی۔ اُردو کے متعلق جو تعلیمی پالیسی طے پائی تھی آج یوپی میں خصوصاً اور دوسرے صوبوں میں اس کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اس لیئے مرکز کا فرض ہے کہ وہ تمام صوبوں میں اس پالیسی پر عمل کرائے اور اردو کو وہ مقام دے جو اس کا حق ہے۔

اُردو کیلئے کوشش قومی نظریہ پر مبنی ہے؟

میں اپنی تقریر کو ان مسائل کے بارے میں ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔ میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ اُردو یا تمدن کے مسئلہ پر یا ایسے ہی دوسرے مسائل پر پاکستان، مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے حوالے دیکر آئندہ جذبات کو غلط طور پر اُبھارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ میرا تو یہ یقین ہے کہ حق کی یہ آواز کہ اردو اسی دیش کے میل ملاپ کی بہترین زبان ہے اور اس کا مقام دلانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے وہ قطعاً قومی نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ اس کو ہرگز اس قسم کی مرعوب کن باتیں دبا نہیں سکتیں۔ اُردو زبان کی تاریخ میں جس طرح مسلمان شاعر نظر آتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہندو سکھ اور عیسائی شاعر پیش پیش نظر آتے ہیں۔

اسلامیانِ ہند کا سردار چل دیا

سوگوار و غم آگیں:- محمد اسحاق حافظ سہارنپوری

ہندوستاں کا طالع بیدار چل دیا
اسلامیانِ ہند کا سردار چل دیا

ہاں عاشقِ جمالِ خداوند اُٹھ گیا
ناموسِ مصطفٰے کا فِدا کار چل دیا

علم و عمل کی محفلِ عالی اُجڑ گئی
مسند نشینِ سیّدِ ابرار چل دیا

اس دور کا مجاہدِ اسلام اُٹھ گیا
آئینِ دینِ حق کا فِدا کار چل دیا

جس قافلہ کی تاک میں رہزن ہیں سیکڑوں
اُس قافلہ کا رہبر و سالار چل دیا

ہاتھوں میں جس کے قوم کا پرچم رہا بلند
صد حیف قوم کا وہ عَلَم دار چل دیا

جس نے خدا کی خلق پہ خود کو کیا نثار
اے دوستو وہ پیکرِ ایثار چل دیا

شاہانِ وقت جس کے قدم چومتے رہے
وہ اِک غلامِ احمدِؐ مختار چل دیا

خود چومتی تھی جس کے قدم بڑھ کے حریت
وہ رہنمائے مردمِ احرار چل دیا

مثلِ حسینؓ جس نے گذاری ہے زندگی
وہ نورِ عینِ حیدرِؓ کرّار چل دیا

ملت کی فکر دل میں رہی جس کے ہر گھڑی
وہ دردِ قوم کا تھا جو بیمار چل دیا

ملتا تھا جس کے قرب سے حافظ سکونِ دل
ٹوٹے ہوئے دلوں کا وہ دل دار چل دیا

مشغلۂ خریدا

تاریخ محمودیت کے پوشیدہ اوراق

مرزا غلام احمد قادیانی کی وہ سیاہ راتیں جو اُس کے گناہوں کو چھپا نہ سکیں۔
مرزا قادیانی کی خانگی زندگی، عینی شاہدوں کی زبانی۔
ان لڑکیوں کے بیانات جن کی عصمتیں مرزا سے بچ نہ سکیں۔
بے بس، معصوم، بے گناہ لڑکیوں کی زبانی وہ سچے واقعات جن کو سن کر آپ کانپ جائیں۔
سیکڑوں حقیقت افروز بیانات جو سند کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ ایسی کتاب آپ نے کبھی نہیں دیکھی ہوگی
مرزا کے مکر و فریب کا پول، دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔
ایڈیشن محدود قیمت صرف تین روپے۔

فسادات جبل پور اور ساگر

مسلمانوں کے خون سے کھیلی ہوئی ایک ہولی کی داستان۔
وہ تاریخی واقعات جنھوں نے مدھیہ پردیش کو شمشان بھومی بنا دیا تھا۔
جبل پور اور ساگر میں مسلمانوں پر توڑے گئے ظلم و ستم کی خونچکاں داستان۔
معصوم بچوں کی چیخیں، ضعیفوں کی کراہتی آوازیں۔ دن دہاڑے بے گناہ مسلمانوں کا قتل و غارت گری۔
ملک کے غیر جانبدار، حق پرست لیڈروں کے لرزہ خیز بیانات
ایڈیشن محدود۔ جلد منگائیے۔ ورنہ کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ قیمت انگریزی ایڈیشن ایک روپیہ پچیس پیسے
قیمت اردو ایڈیشن دو روپے۔

جارحانہ فرقہ پرستی

اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی اور مغربی یوپی کے منظم فسادات کی مکمل تفصیلات ہیں۔ مظلوم مسلمانوں کے خون سے رنگی ہوئی یہ داستان اُن وحشیوں کے مظالم سے لبریز ہے جنھوں نے نہتے اور بے سر و سامان انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یہ حقیقت افروز تاریخی واقعات ہیں جو اندھیری رات کے مایوس کن ماحول کے باوجود کسی آنے والی صبح کا انتظار کر رہے ہیں۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

یہ کتابیں اور ہر قسم کی علمی، دینی، مذہبی، تاریخی کتابیں بکفایت ملنے کا پتہ:-

مکتبہ مشرب دیوبند یوپی

قصص القرآن کا مصنف

زبیر احمد فاروقی جونپوری

تری آہِ صبح گاہی، ترا نالۂ شبانہ،
یہی یاد رہ گیا ہے شبِ غم کی داستاں سے

اکثر و بیشتر لوگ تو مولانا حفظ الرحمٰن رحؒ کو محض اس حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں کہ وہ ایک بیباک قومی رہنما، مسلمانوں کے لیڈر، ملک و وطن کے نہایت ہی وفادار خادم، ملک دشمن عناصر کے شدید مخالف، آزادیٔ وطن کے سلسلے میں قربانی دینے والے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مظلوموں کے لیۓ پشت و پناہ اور جمعیۃ علماء ہند کے فقید المثال ناظمِ اعلیٰ تھے۔

لیکن ایک مخصوص طبقہ میں مولانا اس حیثیت سے بھی متعارف ہیں کہ وہ "قصص القرآن"، "بلاغِ مبین" "اسلام کا اقتصادی نظام"۔ "حفظ الرحمٰن علی مذہب النعمان" اور "سیرتِ رسول" جیسی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا کا طبعی رجحان سیاست کی طرف تھا۔ اسی وجہ سے وہ "دارالعلوم دیوبند"۔ "جامعہ ڈابھیل" اور "پیارم پیٹ (مدراس)" کی درس گاہوں میں زیادہ دنوں تک تدریسی خدمت انجام نہ دے سکے اور ان کا فطری رجحان انھیں میدان سیاست کی طرف کھینچ ہی لایا۔ میدانِ سیاست میں آکر مولانا نے جس استقلال، جواں مردی، بیباکی اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا۔ وہ ہندوستان کے چھوٹے بڑے ہر شخص پر واضح ہے۔ سیاست کے میدان میں وہ اس طرح جمے کہ پھر کوئی طاقت انھیں ہٹا نہ سکی۔ اور آخر عمر تک وہ ملک کے مفاد کی راہ میں قربانیاں دیتے رہے۔ مولانا رحؒ کی خداداد صلاحیتوں نے انھیں جو قبولیتِ عام اور ہر دلعزیزی کی سند عطا کی تھی وہ شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کے انتقال پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ واقعی ہندوستان کا کوئی قومی رہنما اٹھ گیا ہے۔

جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

علمی میدان میں بھی مولانا رحؒ کسی سے پیچھے نہ تھے، ان کی خطابت و انشاء میں لطافت اور بے باکی کا حسین امتزاج ہوتا تھا۔ ان کی تقریروں میں مولانا محمد علی جوہر رحؒ کی تیزی و بے باکی۔ ابو الکلام رحؒ کا بانکپن۔ عطاء اللہ شاہ بخاری رحؒ کی ساحرانہ ادائیں اور مولانا مدنی رحؒ کی سچائی اور سادگی تھی۔ تحریروں میں مولانا انور شاہ رحؒ کی علمی بصیرت، مولانا عثمانی رحؒ کا دل کش طرزِ نگارش، ظفر علی خاں کی شعلہ انگیزی، مولانا نانوتویؒ کی ناقدانہ نظر، اور شیخ الہند رحؒ کا علمی تبحر جھلکتا ہے۔

علمی دنیا میں مولانا کی دائمی شہرت کے لیۓ ان کی صرف ایک معرکۃ الآراء اور بصیرت افروز تحقیقی تصنیف "قصص القرآن"، ہی کافی تھی۔ اس کے مطالعہ کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے

محقق اور صاحبِ علم و بصیرت کی تصنیف ہے۔ جسے آیاتِ قرآنی اور اُن کی تفاسیر پر پُورا پُورا عبور حاصل تھا سِیَر و تاریخ اور آثار و واقعات پر پُوری پوری نظر تھی۔ اس کتاب نے مولانا رح کو علمی حلقوں میں ایک خاص مقام عطا کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے علاوہ اگر مولانا کی کوئی اور تصنیف نہ بھی ہوتی تب بھی ان کی علمی شہرت میں کوئی فرق نہ آتا۔

قصص القرآن اس مردِ مجاہد کا ایک جلیل القدر علمی کارنامہ ہے جسے علم و فن کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

تاریخ جیسے خشک موضوع میں زورِ قلم اور روانئ طبع سے دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دینا کچھ آسان نہیں ہے۔ لیکن قصص القرآن اور مولانا کی دوسری کتابوں میں اس قسم کے نمونے اکثر و بیشتر ملتے ہیں۔

"انسان، انسانیت کے امتیازات و خصائص سے بنتا ہے، ورنہ حیوان سے بھی بدتر ہے اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان کو ہر قسم کی دولت و حشمت اور سامانِ عیش میسّر ہوں اور سطوت و طاقت بھی بے اندازہ نصیب ہو، تو اس وقت بھی خدا اور خوفِ خدا سے ہرگز بیگانہ نہ ہو!" "(قصص القرآن حصہ سوم صفحہ ۴۳۰"

مولانا رح کی سلاستِ تحریر کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرماتے چلیں!۔

"دور آپ دور نہ جائیے!۔ روزانہ ہونے والے انقلابات ہی کو دیکھئے، اور اس سے حقیقت کی صداقت کو وزن کیجئے! شبِ دیجور کی حیاتِ چند ساعت کا جب پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور طلوعِ آفتاب عالمتاب کی وجہ سے اس کو پیامِ مرگ مل جاتا ہے، تو یہ نہیں ہوتا کہ رات کے آخری کنارہ پر پہونچ کر وہ کائنات کو اپنے رخِ روشن کا جلوہ دکھا دیتا ہو۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اول افقِ مشرق میں سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی کو روشنی سے بدلتا جاتا ہے۔ اس وقت ہر ذی ہوش یہ سمجھ جاتا ہے کہ خورشید کی تنویر کا وقت آپہونچا۔ گو نیند کے مارے شبِ تاریک کی مرگِ ناگہانی اور سپیدۂ صبح کی منادئ طلوعِ آفتاب سے غافل سوئے پڑے رہتے ہیں، لیکن مردِ باہوش اس علامت کو دیکھکر روزِ روشن کی آمد کا پتہ لگا لیتے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں۔ تاکہ آفتابِ عالم تاب کی ضَو فشانی سے قبل ہی خود کو اس کے خیر مقدم کے لائق بنا سکیں!"
(قصص القرآن حصہ سوم صفحہ ۳۸۲)

سیاست میں تو کوئی آپ کا ہم پلّہ تھا ہی نہیں۔ لیکن علم و تحقیق کی دوڑ میں بھی مولانا بہت آگے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا کا سیاسی احساس و شعور، تدبر اور اس کی پختگی، ان کی علمی ذہانت اور فطری ذکاوت ہی کی مرہونِ منت تھی۔ اور ان کی سیاسی حیثیت ان کی علمی حیثیت ہی کے تابع تھی۔

حضرت مولانا کے تعلیمی دور کا بڑا حصہ دارالعلوم دیوبند میں گذرا ہے۔ دارالعلوم ہی میں آپ نے بڑھا اور پھر اکابرِ دارالعلوم نے آپ کی خداداد صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کرکے دارالعلوم ہی میں آپ کو

ں و تدریس کی خدمت پر مامور فرمایا۔ زمانۂ قیامِ دارالعلوم اور دارالعلوم کے بعد پھر جامعۂ اسلامیہ
ابھیل،، کے ایام تعلق میں آپ کو اپنے محبوب استاذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رح سے سالہا
سال تک علمی استفادہ کا موقعہ ملا۔ درسی علوم و فنون کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی آپ نے گہرا
مطالعہ اپنے استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ نگرانی کیا، اور اپنی علمی خدمات میں بھی انہی سے رہنمائی حاصل کی۔
گویا عمر کا یہ ابتدائی حصہ آپ کی علمی زندگی کی بنیاد تھا۔ اور یہ بنیاد حضرت علامہ انور شاہ رح جیسے عالمِ یگانہ
کی سرپرستی میں مستحکم ہوئی۔

علم و فن کے افق پر ایک روشن ستارہ تھا جو غروب ہو گیا، میدانِ سیاست کا ایک جانباز مجاہد تھا جو
اجل کے تیروں کا ہدف بن گیا۔

ایک کامل انسان تھا، جسے قدرت نے علم و سیاست، فکر و تدبّر اور خلوص و دیانت داری کے خمیر سے
پیدا کیا تھا۔ اس میں علم بھی تھا اور عمل بھی۔ جوش بھی تھا اور ہوش بھی۔ خود داری بھی تھی اور انکساری بھی۔ وہ
مشرقی تہذیب کا صحیح نمائندہ اور یورپین تہذیب کا سخت دشمن تھا۔ علم و سیاست کی سنجیدگی سے اُسے
وافر حصہ ملا تھا۔ وہ خطابت کا شہسوار تھا اس کی تقریروں میں جادو اور سحر کی کیفیت ہوتی تھی۔ وہ اسلام کی
چلتی پھرتی تلوار تھا۔ اس کا دل صرف اپنی قوم اور وطن کے لیئے دھڑکتا تھا۔ قوم کے لیئے اس کے دل میں وہی
درد تھا، جو ابو الکلام آزاد، محمد علی جوہر۔ ظفر علی خان اور حسین احمد مدنی رح کے دلوں کو بے چین کیئے رہا۔

مولانا حفظ الرحمٰن رح کی وفات اس قدر غم انگیز نہیں جس قدر یہ احساس تکلیف دہ ہے کہ اب اُن کی جگہ
پُر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اہلِ محفل کی نگاہیں متلاشی اور متجسّس ہیں لیکن کوئی چہرہ ایسا نظر نہیں آتا، جو
نگاہِ انتخاب میں آسکے، کوئی ایسا مرد نہیں دکھائی پڑتا، جس کے روز و شب خدمتِ خلق کے لیئے وقف
ہوسکیں۔ جسے خدمتگذاری اور شب بیداری کی دولتیں نصیب ہوئی ہوں جو ایک طرف تو علم و فن میں نادر
روزگار ہو اور دوسری طرف کارزارِ سیاست کا بھی علم بردار ہو۔ اگر ایک طرف مجالس تقریر و تحریر کا مرد
ہو تو دوسری طرف بلا نوشانِ زمانہ میں بھی اُسے ایک خاص مقام حاصل ہو۔ خواص سے بھی متعلق ہو اور عوام
میں بھی مقبول۔ لیکن شاید اب ہم ان اوصاف و فضائل کی انجمن۔ اور مولانا حفظ الرحمٰن رح جیسا جامع الصفات
مرد بے باک نہ دیکھ سکیں۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

زمانہ صدیوں سے اپنے ایک خاص نظام پر عامل ہے۔ رات، دن کے انقلابات، صبح و شام
کی آمد و رفت اور گردشِ افلاک صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ فلک کے سالہا سال تک چکّر لگانے کے
بعد کوئی صاحبِ نظر وجود میں آتا ہے۔ مولانا بھی ایک صاحبِ نظر انسان تھے اور صاحبِ نظر انسان کا
وجود بہت قیمتی ہوتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ اس سے پہلے بارہا یتیم ہوچکی ہے لیکن اس مرتبہ یتیمی کا احساس شاید زائل
نہ ہوسکے۔ مولانا آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنی رح کے انتقال پر بھی لوگوں نے آنسو بہائے، مفتی کفایت اللہ
مولانا احمد سعید رح کی وفات کا حادثہ بھی کچھ کم رُلانے والا نہ تھا۔ اس حادثے پر بھی آہ و زاری کی

گئی۔ لیکن مجاہد ملت کی وفات پر تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ قلوب آنکھوں کی راہ سے آنسو بن کر نکل گئے ہیں۔ آنسوؤں کے تمام قطرے اس مردِ مجاہد کے سوگ میں کام آگئے۔ شاید اس خیال سے کہ اب یہ آنسو کس کے لیئے باقی رہیں۔ اب کون ہے جس کی وفات پر آنکھیں نم اور دل رنجور ہوں گے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت کا مسئلہ اس دور میں جس قدر دشوار ہو گیا تھا اور جو نامناسب حالات پیدا ہوگئے تھے وہ حالات پچھلے رہنماؤں کی راہ میں حائل نہ تھے۔ امتِ مسلمہ کو پچھلے رہنماؤں نے بھی تباہی و بربادی سے بچایا اور صحیح طور پر مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے پر لگانے کی کوشش کی، لیکن ان کی راہ میں اتنی دشواریاں نہ تھیں، مخالف طوفانوں کا اس قدر ہجوم نہ تھا۔ اتنی ناقابلِ عبور چٹانیں نہ تھیں۔ راستہ اگرچہ ناہموار تھا لیکن اتنا ناہموار بھی نہ تھا کہ اس پر سے گذرنا ناممکن ہو۔ مگر حفظ الرحمٰن رح کی قیادت کو جو دور ملا تھا وہ مخالف حالات، سیاسی کشمکش، فرقہ وارانہ ماحول، اپنوں اور غیروں کی بے گانہ وشی کے اعتبار سے نہایت ہی آزمائش کا دور تھا، لیکن بایں ہمہ وہ مردِ مجاہد تن تنہا مسلمانوں کی جماعت کو حالات کی کشمکش سے جس حسن و خوبی اور کمال کے ساتھ نکال لے گیا وہ اسی کا حصہ تھا۔ بقول شخصے:-

"ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں کا بھرم اسی کے دم سے باقی تھا"

بہر حال یہ ماننا ہی پڑے گا کہ حفظ الرحمٰن رح کی ذات ہر اعتبار سے کامل تھی، وہ علمی مجالس کا بھی ہیرو تھا اور سیاسی میدان کا بھی سپاہی تھا۔ آج علمی مجالس اور سیاسی میدان دونوں میں حفظ الرحمٰن کی کمی نظر آتی ہے۔

اپنی زندگی کی بہاروں کو گلستانِ وطن کی آرائش کے لیئے وقف کرنے والا، علم و فن کا دلدادہ، سیاست کا امام، جادو بیان خطیب، بے مثل انشاء پرداز، مسلمانوں کا آخری سہارا۔ قوم و وطن کا سچا وفادار اور اپنے وقت کا نڈر اور بے باک انسان بھی اپنے مشن کے بانیوں سے جا ملا۔

اس کی آوازِ حق کبھی باطل کے سامنے نہ دبی۔ جس نے اپنی زندگی کو نذرِ وطن کر دیا، ہر قدم پر مصیبتیں جھیلیں، لیکن اپنی خود داری کو مجروح نہ ہونے دیا۔ اس کی باتوں میں بلا کی اپنائیت تھی۔ اس کے غصے میں بھی پیار و شفقت کا انداز تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس دنیا سے چلے گئے لیکن اپنے خلوص اور محبت کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

قطعہ تاریخ وفات مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس سرہ

از: ثروت حسین سیوہاروی

حیف رخصت ہوئے حفظ الرحمٰن	جسمِ ملت میں تھے جو مثلِ جان
میں نے تاریخ لکھی اے ثروت	وائے وائے گئے[1] حفظ الرحمان
	۸۲ ۵ ۱۳

[1] چلے گئے

مولانا حفظ الرحمٰن جب پٹھانوں سے ملے

از جناب
رام سرن نگینہ سرحدی

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا ؟
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے متعلق لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، ان کی زندگی کا ہر پہلو ایک داستان ہے۔ داستانِ عظیم!۔ وہ ایک مرکز تھے جن کے گرد انسانیت رقص کرتی تھی، یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ ایک ایسا سرچشمہ تھے، جہاں سے سیاست، ادب، وطنیت اور اتحاد کی دھاریں بکھر کر ملک کے ہر گوشے کو سیراب کرتی تھیں اور یہی دھاریں افق کے اس پار پٹھانوں کے دیش میں بھی پہنچیں، پٹھانوں کا دلیش انگریز جیسے جاہل، اُجڈ، خونخوار اور وحشی کہہ کر پکارتے تھے، جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف بندوق کی زبان ہی جانتے ہیں، بات بات پر خوں ریزی ان کا قدیم پیشہ تھا لیکن یہ محض پروپیگنڈہ تھا۔ انگریزی مفاد کا تقاضا تھا کہ وہ ایسے ہتھکنڈے استعمال کرے۔

اس کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان سے لگا یئے۔

"سرحد کا پٹھان بہت خلیق ہے، اس کی ایمان داری اور شرافت کا اظہار ممکن نہیں"

اور انہی کے متعلق حضرت مولانا حفظ الرحمٰن نے ارشاد فرمایا تھا۔

"پٹھان پیدائشی آزاد ہے وہ کسی کی غلامی برداشت ہی نہیں کرسکتا۔"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب جنرل انتخابات ہورہے تھے، کانگریس اور مسلم لیگ میں باہمی ٹکراؤ تھا، آزادی اور غلامی میں جنگ تھی۔ سرحد کے پٹھان بھی چناؤ کی مہم میں سرگرم تھے، تیس لاکھ پٹھانوں کے سامنے ہندوستان کی آزادی کا سوال تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی غلامی کی ذلیل زندگی برداشت نہیں کرسکتے تھے لہٰذا انھوں نے اپنے محبوب لیڈر خان عبدالغفار خان سے کہا کہ وہ مولانا حفظ الرحمٰن کو بلائیں، وہ جانتے تھے کہ مولانا کی تشریف آوری لیگیوں کی تمناؤں پر برق بن کر گرے گی، مولانا کی ضرورت سبھی کو تھی، ہندو کو بھی اور مسلمان کو بھی۔ کانگریس کو بھی اور سوشلسٹوں کو بھی۔ ہر طبقہ، ہر گروہ ان کی ذاتِ گرامی پر اعتماد رکھتا تھا، وہ کسی ایک فرقہ کے لیڈر نہ تھے، ان کے دل میں سبھوں کے لئے پیار تھا، محبت تھی، خلوص تھا اور یہی خلوص آخر ایک دن انھیں سرحد کی ٹیڑھی ترچھی وادیوں میں لے آیا۔

آج سے تیس۳۰ برس پہلے، پشاور کانگریس کمیٹی کے دفتر میں اطلاع آئی کہ کل رات کو مولانا حفظ الرحمٰن پشاور تشریف لارہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، پشاور کی سیاسی جماعتیں استقبال میں محو دکھلائی دینے لگیں۔ خدائی خدمتگاروں کے دستے گاؤں گاؤں سے شہر کی سمت بڑھنے لگے۔ کانگریس سیوادل۔ سوشلسٹ والنٹیر

جمعیۃ العلماء کے جاں باز ورکرز، سکھ فیڈریشن اور دوسری جماعتوں کے رضا کار، شہر کے کونے کونے میں پھیل گئے تاکہ مولانا کی آمد کا پتہ سبھی کو لگ سکے، ادھر لیگی ورکرز تلملا اٹھے، وہ مخالفانہ پروپیگنڈے پر اتر آئے لیکن آزادی پسند قوتوں کے سامنے ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا، اور جس شام کو حضرت مولانا ریلوے اسٹیشن پر آئے تو ہزاروں ہاتھ سلام کے لیے اٹھے، بے شمار پھول ان کے گلے کی زینت بنے۔ زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے ایک بار فضا میں نئی زندگی دہرادی، بڑی مشکل سے مولانا کو کار تک لایا گیا اور کار رینگ رینگ کر ریلوے اسٹیشن سے پشاور کے چوک یادگار تک پہنچی، جہاں جلسے کا پروگرام تھا۔ یہ چوک سیاسی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا، یہاں ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر اپنے خیالات کا اظہار کرچکے تھے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں ۲۳ را پریل ۱۹۳۰ء کو گڑھوالی سپاہیوں نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کیا تھا۔ اس وقت رات کے سات بج رہے تھے، چوک یادگار کا علاقہ لوگوں سے اٹا ہوا تھا۔ نہ جانے انسانوں کا یہ سیلاب کہاں سے امڈ پڑا، دراصل یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ جو مولانا کے لیے دلوں میں موجود تھا، ہزاروں نظریں اس وقت اونچے پلیٹ فارم پر دوڑ رہی تھیں، جہاں آزادی کے پرچم لہرا رہے تھے، اچانک ایک آواز بلند فضاؤں میں گونجی:۔

"مولانا حفظ الرحمٰن زندہ باد"

اور اس کے ساتھ ہی ایک سپاس نامہ پڑھا گیا، جس کے چند فقرے یوں تھے:۔

"آزادی کے مجاہد! انسانیت کے روشن چراغ۔ سرحد کے پٹھان اپنا پاک دل لے کر تجھسے ملنے آئے ہیں"

میں اس وقت بیمار تھا، الیکشن کی سرگرمیوں نے میرا دم توڑ کر رکھ دیا، لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت مولانا آئیں اور میں ان کے دیدار سے محروم رہوں، میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ساتھی نے آکر کہا۔ مولانا صاحب کل صبح پشاور سے باہر دورے پر جارہے ہیں، اب میری سوچ ختم ہوگئی میں بیماری میں ہی کانگریس دفتر کی سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا تانگہ پر سوار ہوگیا اور تھوڑی سی دیر میں منزلِ مقصود تک جا پہونچا۔ مولانا اس وقت تقریر فرمارہے تھے، میں اسٹیج کے پیچھے ایک سرخپوش کے سہارے بیٹھ گیا لیکن میری نظریں برابر اُنھیں دیکھ رہی تھیں، مجھے ان کی تقریر کے لفظ تو یاد نہیں، لیکن چند ادھورے فقرے یاد ہیں جو تحریک پٹھانستان کے دنوں میں میں نے مولانا کی تقریر سے دیئے تھے۔ انھوں نے فرمایا:۔

"پٹھانوں کے خلوص نے مجھے اتنا متأثر کیا ہے کہ زندگی تک میں انھیں بھول نہیں سکتا ان کی بہادری، جرأت، پاکیزگی کا میں قائل ہوگیا ہوں۔ پٹھان بھائیو! میں آپ سے ملنے آیا ہوں، آپ نے ملک کی آزادی کے لیے جو شاندار اور پرامن لڑائی لڑی ہے۔ اس کے لیے میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں"

بادشاہ خان کے متعلق آپ نے فرمایا:۔

"وہ ایک ایسے مجاہد ہیں جن پر صدیاں ناز کریں گی، انہوں نے اپنے عمل سے پٹھانوں کی زندگی بدل دی ہے"

مجھے ٹھیک یاد نہیں، لیکن مولانا کی تقریر میں آزادی، یک جہتی، قربانی اور وطن پرستی کے جذبات اس قدر نمایاں تھے کہ اس رات لوگ بازاروں میں انھیں کے تذکرے کرتے رہے۔ خصوصاً قصہ خوانی بازار میں تو رات بھر میلہ سا لگا رہا، ہندو اور مسلمان مولانا کی تقریر پر بحث کرتے دکھلائی دیئے۔ ادھر لیگیوں کی فرقہ وارانہ چالبازیوں کو مولانا کی تقریر نے حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔ کانگرس دفتر میں ساری رات یہی چرچا رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا کی تشریف آوری نے پشاور کی سیاست کا رخ پلٹ دیا۔ کل تک شہری مسلمان لیگ کے گن گا رہے تھے اور آج کانگرس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے، پراونشل کانگرس کمیٹی نے مولانا کی تقریر ایک پیغام کی صورت میں شائع کر کے سرحد کے اہم علاقوں میں بٹوائی۔

پاکستان بننے کے بعد میں نے عہد کر لیا کہ ایک بار حضرت مولانا سے ضرور ملوں گا، اور میری یہ خواہش اس وقت پوری ہوئی جب میں پٹھانستان ڈے منانے کے سلسلے میں اپنے چند ہندو دوستوں کے ہمراہ ان سے ملا، یہ ملاقات اگرچہ مختصر تھی لیکن نہایت اہم ہے۔ صبح کا وقت تھا حضرت جمعیۃ العلماء کے دفتر میں تشریف فرما تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ اتفاقی صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں تو وہ انتہائی خلوص سے ملے اور جب میں نے اُن سے عرض کی کہ میں مفتیٔ اعظم حضرت مولانا عبد الرحیم پوپلزئی کے ساتھ برسوں تک رہا ہوں وہ میرے سیاسی معلم تھے۔ تو مولانا صاحب بہت خوش ہوئے۔ مولانا کی اس ملاقات نے مجھ پر گہرا اثر کیا، اور جب حضرت نے "پٹھانستان ڈے پر گاندھی گراؤنڈ میں تقریر کی تو سرحد کے لوگ پھر ایک بار مولانا کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ مولانا کی یہ تقریر بھی نہایت اہم تھی، آپ نے فرمایا:۔

"صوبہ سرحد نے بادشاہ خان کی دانائی اور جسارت کی بنا پر عدم تشدد کا مظاہرہ کر کے صوبے کی شان کو اونچا کیا، اور ننانوے فی صدی آبادی نے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ کانگرس کے ساتھ ہے لیکن اس کے باوجود ہم نے یہ نہ چاہا کہ اس صوبے کو کاٹ کر ایک ملک بنائیں، آج ہم آزادی کا پھل پا رہے ہیں لیکن بادشاہ خان اور ان کے ساتھیوں پر آج بھی مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ سیاست کو چھوڑ کر انسانیت کے نام پر بادشاہ خان اور ان کے ساتھیوں کی رہائی کے لیئے آواز اٹھائیں"۔

مولانا صاحب سے میری یہ آخری ملاقات تھی اس کے بعد بارہا انھیں دیکھا، جلسوں میں بھی اور پارلیمنٹ میں بھی۔ اور آج جب آزادی کے بے خوف راہ نما حضرت مولانا حفظ الرحمٰن دنیائے فانی کو چھوڑ چکے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ اب ان لوگوں کا کیا بنے گا جو آسانی سے حضرت تک پہنچ جایا کرتے تھے، غریب ہو یا امیر، ہندو ہو یا مسلمان، کسی نقطۂ نظر کا بھی ہو، اس کی آواز حضرت کے کانوں سے ٹکراتی تھی۔ وہ ہر جگہ دہلی کی گلیوں سڑکوں اور سرکاری اداروں تک پہنچتے دکھلائی دیتے تھے، حقیقت میں انھیں صرف ایک لیڈر کہنا غلط ہو گا، وہ ایک ہی وقت میں راہ نما بھی تھے اور سپاہی بھی۔ اگر وہ لوگوں کی راہ نمائی کرتے تھے تو ضرورت کے وقت ایک سپاہی کی طرح خود بھی ہر محاذ پر مردانہ وار پہنچ جاتے تھے، ان کی زندگی انسانیت کی بے لوث خدمت میں گذری۔ کاش وہ کچھ عرصہ ہمارے درمیان اور رہتے۔

مجاہدِ ملت کی وفات پر

از کفیل الرحمن نشاط عثمانی

اور کچھ پھیل گیا حزن والم کا سایا
اور اک دیپ بجھا اور اندھیرا چھایا

دل پہ بجلی سی گری ضبط کا دامن چھوٹا
فلکِ علم کا تابندہ ستارا ٹوٹا

اور اک عالم دیں بزم جہاں سے اٹھا
اور اک شیریں بیاں اہل بیاں سے اٹھا

اور اک واقفِ اسرارِ شریعت نہ رہا
اور اک ماہرِ ارباب سیاست نہ رہا

اک کڑی ٹوٹ گئی جہد کے افسانے کی
اور کچھ تاب گئی زہد کے کاشانے کی

وعظ وتقریر کا بازار بھی اب سرد ہوا
تیرے اُٹھنے سے زمانے کا سکوں فرد ہوا

رحلتِ مجاہدِ ملت

از راغب صدیقی

دل میں فریاد ہے لبوں پہ آہ
آنسوؤں کی لگی ہوئی ہے جھڑی
مضمحل ہے مزاج ملت کا
آج ہر فرد وقفِ ماتم ہے
وہ شعارِ لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ
وہ رئیس المقررین نہ رہا
ہائے کس سے کہیں گے دل کی بات
کون کانٹوں پہ مسکرائے گا؟

پیش آیا ہے وہ غمِ جاں کاہ
لے گئی ساتھ "چین" غم کی گھڑی
گر گیا سر سے تاج ملت کا
موت العالِم بھی موت العالَم ہے
پرچمِ امن تیشۂ فرہاد
خاتمِ قوم کا نگیں نہ رہا
قوم کو دے گا کون درسِ حیات
کون جلسوں میں دندنائے گا؟

کردے سالِ وفات تو بھی بیاں
حفظِ رحمان ہائے آپ کہاں
۱۳ھ ۸۲

تاریخ کے آئینے میں

مرتبہ
مولوی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی (فاضل دیوبند)

ارباب حکومت سے استغناء

ایک دفعہ طاؤس ابن کیسان اور وہب ابن منبہ (دونوں تابعی ہیں) حجاج ابن یوسف کے بھائی محمد ابن یوسف کے پاس تشریف لے گئے۔ محمد ابن یوسف اس وقت گورنری کے عہدہ پر فائز تھا۔ طاؤس رح کرسی پر جا کر بیٹھے تو اس نے ایک ملازم کو اشارہ کیا کہ ایک طیلسان لاکر طاؤس رح کو اڑھادے۔ ملازم نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ حضرت طاؤس رح نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا اور اپنے کاندھے ہلاتے رہے یہانتک کہ وہ طیلسان گر گیا۔ محمد ابن یوسف یہ دیکھکر بے حد ناراض ہوا۔

وہب ابن منبہؒ نے طاؤس رح سے کہا اگر آپ اس طیلسان کو استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے تو اسے بیچ کر اس کی قیمت غرباء میں تقسیم کردیتے۔ بولے اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میرے بعد یہ کہیں گے کہ طاؤس نے طیلسان قبول کرلیا تھا تو مجھے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ تھا۔

صاف گوئی

یزید ابن حبیب (تابعی) بڑے حق گو عالم تھے۔ آپ کو بڑے سے بڑے جابر اور ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کے اظہار میں ادنیٰ تامل بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ بیمار ہوئے تو مصر کا گورنر حوثرہ ابن سہیل آپ کی عیادت کے لیئے آیا اور دریافت کرنے لگا۔ اے ابو رجار (حضرت یزید کی کنیت) جس کپڑے پر مچھر کا خون لگ گیا ہو اس کا حکم کیا ہے؟۔ آپؒ نے یہ سن کر منہ پھیر لیا اور جواب میں کچھ نہیں فرمایا، پھر جب حوثرہ جانے لگا تو آپ نے فرمایا تم روزانہ مخلوقِ خدا کا خون بہاتے ہو اور مجھ سے مچھر کے خون کا مسئلہ دریافت کرتے ہو۔

عدل پروری

اسپین کا اموی خلیفہ الحکم بڑا عادل اور منصف مزاج تھا۔ ایک مرتبہ الحکم کے محل کی توسیع کی گئی تو اس میں ایک غریب بیوہ کی جائداد بھی آگئی۔ اس سے کہا گیا کہ اپنی جائداد کی معقول قیمت لے لے مگر بیوہ رضامند نہ ہوئی بر عمارت نے جبراً یہ زمین لے کر محل میں توسیع کرادی۔

عورت نے قاضی کے سامنے استغاثہ پیش کیا۔ قاضی نے کہا ذرا ٹھہر جا میں انصاف سے کام لوں گا۔ جس دن خلیفہ الحکم پہلے پہل محل کے معائنہ کے لیئے آیا تو قاضی صاحب ایک گدھا اور خالی بورا لے کر

پہنچ گئے۔ الحکم سے ملاقات ہوئی تو قاضی صاحب نے کہا۔ امیرالمؤمنین مجھے اس زمین کی مٹی چاہیئے اگر اجازت ہو تو لے لوں۔ خلیفہ نے ہنس کر اجازت دے دی۔ قاضی صاحب نے اچھی طرح بورا مٹی سے بھرلیا اور خلیفہ سے بورے کو گدھے پر رکھنے میں مدد کی درخواست کی۔ خلیفہ قاضی صاحب کی اس حرکت کو صرف مذاق سمجھ رہا تھا اس لیئے قاضی صاحب کی اعانت کے لیئے آگے بڑھا اور دونوں بورا اُٹھانے لگے مگر وزن زیادہ تھا اس لیئے بورا نہ اُٹھ سکا اور خلیفہ ہانپ گیا۔ قاضی صاحب نے کہا امیرالمؤمنین اس بوجھ کو آپ اُٹھا نہ سکے، تو قیامت کے روز یہ بڑھیا کی زمین جسے ضبط کرلیا گیا ہے کس طرح اٹھائیں گے کیونکہ خدا کے سامنے وہ بڑھیا ضرور دعویٰ کرے گی۔ الحکم یہ سن کر رونے لگا اور حکم دیا کہ محل کا وہ حصہ مع ساز و سامان کے بڑھیا کو دیدیا جائے۔

خلیفہ اور قاضی

پہلے زمانہ کے قاضی بھی پیکرِ عدل اور مجسمۂ انصاف ہوتے تھے اور اس معاملہ میں وہ خلیفہ تک کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

نمیر مدنی کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں منصور عباسی مدینہ منورہ آیا وہاں کے قاضی محمد ابن عمران طلحی تھے اور میں ان کا محرر تھا۔ چند شتربانوں نے کسی معاملہ میں خلیفہ پر نالش کردی۔ قاضی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ منصور کو حاضریٔ عدالت کے لیئے تحریر کرو تاکہ مدعیوں کی داد رسی کی جائے۔ میں نے خلیفہ کو سمن بھیجنے سے معذرت چاہی لیکن قاضی صاحب نے اس پر اپنی مہر لگاکر خلیفہ کے پاس لے جانے کا حکم دیا، چنانچہ میں روانہ ہوا۔ جب منصور کو اس حکم سے مطلع کیا تو وہ فوراً کھڑا ہوگیا اور اہل دربار سے کہا مجھے عدالت میں طلب کیا گیا ہے اس لیئے کوئی شخص میرے ساتھ نہ آئے خلیفہ آیا تو قاضی صاحب تعظیم کے لیئے نہیں اُٹھے اور استقلال کے ساتھ بیٹھے رہے پھر مدعی کو بلایا اور ثبوت کے بعد خلیفہ کے خلاف مقدمہ کا فیصلہ کردیا۔

جب قاضی صاحب حکم سنا چکے تو منصور کہنے لگا خدا تمہیں اس انصاف پسندی کا اجر دے اور خوش ہوکر قاضی صاحب کو دس ہزار دینار انعام میں دیئے۔

ایک دفعہ منصور نے بصرہ کے قاضی سوار ابن عبداللہ کو لکھا کہ آپ کی عدالت میں ایک فوجی سردار اور سوداگر کے درمیان جو مقدمہ چل رہا ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ آپ اس مقدمہ کا فیصلہ سردار کے حق میں کریں۔ قاضی سوار نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا کہ اس شہادت سے جو میرے سامنے پیش ہوئی ثابت ہوتا ہے کہ اس نزاع کا سوداگر کے حق میں فیصلہ ہونا چاہیئے اور میں شہادت کے خلاف ہرگز فیصلہ نہیں کرسکتا۔

منصور نے لکھا قاضی صاحب، آپ کو یہ مقدمہ فوجی افسر کے حق میں فیصل کرنا پڑے گا۔ قاضی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا۔ واللہ میں از روئے انصاف اس کا فیصلہ تاجر کے حق میں کروں گا۔
جب یہ جواب منصور کے پاس پہنچا تو کہنے لگا الحمدللہ میں نے زمین کو عدل و انصاف سے بھردیا،

اور میرے قاضی مقدمات کا فیصلہ حق و انصاف کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

ہارون اور سفیان ثوری

ہارون رشید عباسی اور مشہور محدث امام سفیان ثوری بچپن کے دوست تھے جب یہ خلیفہ ہوا تو سفیان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن سفیان نے پرواہ بھی نہ کی آخر ہارون نے ان کے نام خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

ہارون رشید کی طرف سے سفیان ثوری کے نام۔

میرے بھائی تمہیں معلوم ہے کہ خدا نے تمام مسلمانوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا ہے اور میرے تمہارے جو تعلقات تھے بدستور قائم ہیں میرے تمام احباب خلافت کی مبارک باد دینے میرے پاس آئے اور میں نے ان کو گرانبہا صلے دیئے۔ افسوس ہے کہ آپ اب تک نہ آئے، میں خود حاضر ہوتا لیکن یہ امر شانِ خلافت کے خلاف ہے۔

سفیان ثوری نے اس کا یہ جواب دیا:۔

بندۂ ضعیف سفیان کی طرف سے فریفتۂ دولت ہارون کے نام

اپنے خط میں خود تسلیم کرلیا ہے کہ تم نے مسلمانوں کے بیت المال کے روپے کو بے موقع گرانبہا صلے دے کر خرچ کیا۔ اس پر بھی تمہیں تسلی نہ ہوئی اور چاہتے ہو کہ قیامت کے روز میں تمہاری فضولخرچی کی شہادت دوں، ہارون تمہیں کل خدا کے سامنے جواب دینے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ تم تخت پر اجلاس کرتے ہو۔ ریشمی لباس پہنتے ہو، تمہارے دروازے پر چوکی پہرہ رہتا ہے۔ تمہارے عمال خود تو شراب پیتے ہیں اور دوسروں کو شراب پینے کی سزا دیتے ہیں، خود زنا کرتے ہیں اور چوروں کے ہاتھ کاٹتے ہیں ان جرائم پر پہلے تمہیں اور تمہارے عمال کو سزا ملنی چاہیئے۔ ہارون وہ دن بھی آئے گا کہ تم قیامت میں اس حال میں آؤ گے کہ تمہاری مشکیں بندھی ہوئی ہوں گی اور تمہارے ظالم عمال تمہارے پیچھے ہوں گے اور تم سب کے پیشوا بن کر سب کو دوزخ کی طرف لے جاؤ گے۔ میں نے خیرخواہی کا حق ادا کر دیا اور اب کبھی خط نہ لکھنا

ہارون رشید نے خط پڑھا تو بے اختیار چیخ اٹھا اور دیر تک روتا رہا۔

زہد و تقویٰ

ہاشم ابن قاسم کہتے ہیں کہ رمضان میں شام کے وقت میں خلیفہ مہتدی عباسی کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب چلنے لگا تو مہتدی کہنے لگا۔ ہاشم بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر ہم نے افطار کیا اور نماز پڑھی۔ مہتدی نے کھانا طلب کیا تو ایک بید کی ڈلیا میں کھانا آیا اس میں پتلی پتلی روٹیاں تھیں اور ایک برتن میں تھوڑا سا نمک، دوسرے میں سرکہ اور تیسرے میں زیتون کا تیل تھا۔ مجھ سے کھانے کو کہا۔ میں نے کھانا شروع کیا اور دل میں سوچا کہ کھانا اور بھی آتا ہوگا۔ مہتدی نے میری طرف دیکھکر پوچھا کیا تمہارا روزہ نہیں تھا۔ میں نے کہا روزہ تھا۔ پھر پوچھا۔ کیا کل روزہ رکھنے کا ارادہ نہیں، میں نے کہا رکھوں گا۔ خلیفہ کہنے لگا تو پھر

اچھی طرح کھاؤ اور یہ امید نہ رکھو کہ اور کھانا آئے گا کیونکہ اس کے علاوہ میرے واسطے دوسرا کھانا نہیں ہے۔ یہ سن کر مجھے تعجب ہوا اور عرض کیا کہ امیرالمؤمنین یہ کیا معاملہ ہے۔ خدا نے تو آپ کو تمام نعمتیں دے رکھی ہیں۔ مہتدی نے کہا بات یہ ہے کہ بنو امیہ میں عمرؓ ابن عبدالعزیز سا شخص پیدا ہو اور بنی ہاشم میں نہ ہو۔ اس لیئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

تواضع اور خاکساری

خلفائے عباسیہ میں مامون رشید حلم وعفو اور تواضع و خاکساری میں بے نظیر تھا اس میں تمکنت بالکل نہ تھی ملنے والے تو الگ رہے اپنے خادموں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرتا تھا۔ قاضی القضاۃ یحییٰ ابن اکثم فرماتے ہیں کہ میں نے مامون سے زیادہ شریف الطبع انسان نہیں دیکھا۔ ایک رات مجھے حریم خلافت میں سونے کا اتفاق ہوا۔ ابھی آدھی رات گذری تھی کہ پیاس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ پانی پینے اٹھا تو مامون کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور مجھ سے نہ سونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا امیرالمؤمنین پیاس لگ رہی ہے۔ مامون نے کہا آپ اپنے بستر پر بیٹھیئے اور خود پانی لاکر مجھے دیا۔ میں نے عرض کیا امیرالمؤمنین خادم یا خادمہ کو اٹھالیا ہوتا، بولا سب سوئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا۔ میں خود پانی پی لیتا۔ مامون بولا۔ انسان کے لیئے یہ بڑے عیب کی بات ہے کہ اپنے مہمان سے کام لے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے۔

وفادار ساتھی

ایک مرتبہ ایک شخص نے منصور کے دربار میں بیان کیا کہ خلیفہ ہشام اموی نے فلاں جنگ میں نہایت تدبر وسیاست سے کام لیا تھا۔ منصور کو اس جنگ کے واقعات معلوم کرنے کا شوق ہوا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ رصافہ میں ایک ضعیف العمر آدمی رہتا ہے جو ہشام کا رفیقِ کار رہ چکا ہے۔ منصور نے اس کو بلا کر پوچھا:۔

تم ہشام کے ساتھ رہ چکے ہو؟۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ منصور نے پوچھا فلاں سنہ میں جو معرکہ ہوا تھا اس میں ہشام نے کس تدبیر اور حکمتِ عملی سے کام لیا تھا۔ اس شخص نے جنگ کے واقعات کی تشریح ایسے انداز میں شروع کی جو منصور کو پسند نہ آئی وہ کہنے لگا۔ خلیفہ ہشام اموی خدا اس پر ہزار ہزار رحمتیں نازل کرے۔ اس نے یوں کیا، خدا اس کی قبر کو منور کرے۔ اس نے یہ تدبیر کی۔

منصور آخر ضبط نہ کرسکا اور ڈانٹ کر کہا۔ اے خدا کے دشمن یہاں سے چلا جا، میرے سامنے میرے دشمن کے حق میں رحمت ورضوانِ الٰہی کی دعائیں کرتا ہے۔

بوڑھا واپس ہونے لگا مگر جاتے جاتے یہ کہہ گیا۔ امیرالمؤمنین میں آپ کے دشمن کا اس درجہ احسان مند ہوں کہ موت کے بعد بھی اس سے سبکبار نہیں ہوسکتا۔

منصور نے یہ سن کر اسے واپس بلانے کا حکم دیا۔ جب وہ دوبارہ حاضر ہوا تو کہنے لگا۔ امیرالمؤمنین آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جس شخص کا میں مرہونِ منت ہوں اسے نیکی سے یاد کرنا

کیا میرا فرض نہیں ہے۔

خلیفہ متنبہ ہوا اور کہنے لگا۔ بے شک فرض ہے اور تمہارے خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک شریف الطبع، احسان شناس اور کریم النفس انسان ہو۔

اس کے بعد منصور دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا اور جب وہ جانے لگا تو انعام کا حکم دیا۔ اس کے جانے کے بعد خلیفہ اس کی تعریف کر کے کہنے لگا:۔

”کاش مجھے بھی ایسے مخلص اور وفادار ساتھی مل سکتے!“

مشعلِ خضر

تفسیر فیض الرحمٰن

اعوذ باللہ، بسم اللہ، سورۃ الحمد اور معوذتین کی مکمل تفسیر جو نہایت سلیس اردو میں مستند کتابوں کے حوالہ سے تحریر کی گئی ہے۔ حضرت مولانا یعقوب الرحمٰن صاحبؒ عثمانی سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی آخری تصنیف ہے۔ ہدیہ صرف دو روپے۔

اسلام کیا ہے؟

مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس کے ترجمے ہر زبان میں آگئے ہیں تبلیغی حلقوں میں اپنی مقبولیت کے اعتبار سے اس کتاب کا ایک خاص مقام ہے۔ عوامی انداز اور سہل زبان میں اسلام کی حقیقت اور اس کی مقبولیت پر ایک عمدہ اور مستند مواد پیش کیا گیا ہے۔ ہدیہ دو روپے پچاس پیسے۔

شہیدِ اعظم

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مایہ ناز تالیف ہے جو ایک عبرت آموز سبق ہی نہیں بلکہ سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت کے مستند تاریخی اور علمی مواد سے پوری کتاب لبریز ہے مجلد ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔

پاکستانی نادر کتابیں

کتاب		ہدیہ
بخاری شریف مترجم	در تین جلد	۴۵/.
مشکوٰۃ شریف مترجم	ر ر	۱۸/.
مؤطا امام محمد		۸/.
کتاب الآثار		۸/.
تجرید بخاری		۸/.
انتخاب صحاح ستہ		۵/.
مسند امام اعظمؒ		۸/.
سنن دارمی شریف		۸/.
حجۃ اللہ البالغہ	در دو جلد	۲۰/.
ابن خلدون		۱۵/.
فتاوی رشیدیہ		۸/.
بلوغ المرام		۸/.
ریاض الصالحین	در دو جلد	۲۰/.
بستان المحدثین		۵/.
ازالۃ الخفاء	در دو جلد	۲۰/.
معلم عربی	کامل تین حصہ	۱۱/.

شریعت اور تصوف

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کمیاب تقریر جو بزبان فارسی معہ اردو ترجمہ کے چھاپی گئی ہے۔ اس کتابچہ میں خصوصی طور پر اصطلاحات صوفیہ کو واضح طور پر سمجھایا گیا ہے مترجم نے ہر مشکل مقام کو صاف کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی کاغذ، کتابت، طباعت سب معیاری ہے۔ ٹائیٹل رنگین۔ ہدیہ ۵۰ پیسے

حیاتِ انور

فخر المحدثین علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی اور علمی اور تحقیقی کارناموں کا بیان اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو آپ کو اس صدی کے ایک فقیہ النفس انسان، عشق محمدی میں ڈوبی ہوئی ایک روح علم و فضل کی بلندیوں پر متمکن ایک عالم اور زہد و شرافت کی خوبصورتیوں سے مزین ایک مردِ صالح سے متعارف کرائے گی۔ ہدیہ مجلد چار روپے۔

یہ کتابیں اور ہر قسم کی علمی دینی کتب کا مرکز

مکتبہ مشرب دیوبند ضلع سہارنپور یوپی

ملک و قوم کا رہبر

از
مولوی رشید الوحیدی
(فاضل دیوبند)

کسی عہد اور تاریخ کے وجود میں ہم اس ترتیب سے قطع نظر نہیں کرسکتے کہ حالات افراد کو بناتے ہیں اور افراد سے تاریخ بنتی ہے۔ اس بنیاد پر ہمارا یہ کہنا بھی رسم ومبالغہ سے خالی اور ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے حالات کی تاریخ کی آخری کڑی اور اس اہم انقلابی عہد کی آخری اینٹ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تھے

حضرت مولانا رح کی صحبت اور ان کی مجلس بہت نصیب ہوئی۔ قریب و دور سے بارہا ان کے پاس رہنے کا موقع ملا یہ ضرور ہے کہ ان کی قومی و علمی عظمت ہمیشہ اُن سے قریب آنے میں رکاوٹ بنا رہی اور جس قدر ان سے بے حجاب ملنے کا موقع ملا حجاب بڑھتا ہوا رہا۔ بعض مجلسوں میں ہمت کرکے کوئی سنجیدہ سوال کیا بھی مثلاً ایک بار "قصص القرآن" کے سلسلے میں اسی طرح "اسلام کا اقتصادی نظام" کے کچھ پیچیدہ مواقع پر خود مصنف کی زبانی وضاحت کی نیت سے کچھ عرض کیا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی عادت کے مطابق تدریجاً بلند آواز ہوتے گئے اور میں دبتا چلا گیا اس لیے کچھ زیادہ استفادہ اور استفہام کا موقع نہ مل سکا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے قریب رہنے والے بڑے پسندیدہ انداز میں مولانا کی یہ عادت بیان کرتے کہ مولانا جب تک کسی کو ڈانٹ نہ لیتے۔ ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کوئی غرضمند حاضر ہوا عرضِ مطلب سے پہلے ایک زوردار گھڑک اُسے سننے کو ملتی۔ مگر جاننے والا اس مرحلے سے آسانی سے گذر جاتا کیونکہ وہ پہلے سے تیار رہتا تھا اور جب طوفان تھمتا تو وہ اپنے مطلب کی شروع کر دیتا۔ آخر مولانا رح کی دوسری فطرت نمایاں ہوتی اور آنے والے کا مطلب پورا ہوجاتا تھا۔ اور اس کے لیے فون، خط کے علاوہ بسا اوقات مولانا رح کو خود بھی غرض مند کے ساتھ دور دور جانا پڑتا تھا۔ کچھ دنوں بعد تو حضرت مجاہد ملت کی تیز کڑک دار بارعب ڈانٹ میں بادِ نسیم کی لپک اور بلبل کا نغمہ محسوس ہونے لگا تھا اور آج آہ کان ترس رہے ہیں اسی ڈانٹ کو، اور آنکھیں رو رہی ہیں اس بپھری ہوئی خشمگیں نگاہوں کو۔

مجاہد ملت کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو بعض عام عنوانات کے تحت۔ عالمانہ زندگی، سیاسی زندگی نے مصلح قوم، نڈر سپاہی انسانیت نواز اور سچے مسلمان کا شمار ہوتا ہے، ان میں سے فی الواقع ہر گوشہ اپنے اندر ایک تاریخ ایک عہد لیے ہوئے ہے جس سے تفصیلی بحث نہ یہاں ممکن ہے نہ مقصود، حفظ الرحمٰن رح مر گئے مگر قلوب اور اذہان کے دریچے ان کے لیے کھل گئے۔ مورخ کا قلم ان کی یاد اور ان کے کارناموں کو بیان کرتے ہوئے فخر محسوس کرے گا۔

درس و تدریس کا مشغلہ اسی طرح علمی تصنیف و تالیف، مولانا عرصہ ہوا چھوڑ چکے تھے بلکہ یوں کہیے کہ قوم اور ملک کی خدمت نے انھیں ایسا متوجہ کیا کہ اس طرف پوری طرح وقت نہ دے سکے مگر ماضئ بعید کی یہ زریں حیثیت ان کی زندگی کا ایسا اہم اور تابناک باب ہے جہاں سے ان کی شخصیت کے ارتقاء کی داستان

شروع ہوتی ہے اور پھر وہ خدمت کچھ ایسی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ حال کی شہرت وعظمت سے ماضی کی اس نمایاں کوششوں پر غبار آسکے، دارالعلوم دیوبند، مدرسہ ڈابھیل، اور ڈابھیل کی مجلس علمی، کلکتہ کی مسجد ناخدا، اشاعت اسلام قرول باغ۔ یہ ایسی مضبوط شہادتیں ہیں جن کے سینوں میں ابھی حفظ الرحمٰن کی صدا بازگشت بن کر تھرا رہی ہے۔ اسی طرح، اسلام کا فلسفۂ اخلاق، قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام۔ تحقیق وریسرچ کا ایسا انمول خزانہ اور ایک اسلامی طالب علم کے لیئے ایسا عطیہ ہے جس کی بنا پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا نام آسمانِ علم پر ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

مولانا رح کی علمی عظمت کو ادب تحریر تصنیف وتالیف کی نگاہ سے پرکھنے والوں کے لیئے ندوۃ المصنفین دہلی کا قیام ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی متحرک کوشش ہے جس کے فیض سے آنے والی نسلیں اپنے شوقِ تحریر اور ذوقِ ادب کے ساتھ تحقیقی عالمانہ کوششوں کو تسکین دے سکیں گی اور ساتھ ہی اپنے مطالعہ اور ذہن کے سرمائے کو دنیا کے سامنے اس یقین کے ساتھ پیش کرسکیں گی کہ ان کی تحریر زمانے میں نگاہِ قبول حاصل کر چکی ہے کیونکہ دار المصنفین کے لیئے یہی معیار اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ باقی ان کی فاضلانہ عظمت کا مکمل زندہ ثبوت مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا بدر عالم صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، مولانا یوسف بنوری۔ شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب دے سکیں گے جو اس میدان میں ان کے رفیق کار یا معاون رہ چکے ہیں۔

مولانا رح کی سیاسی زندگی زمانۂ حال کے لیئے ایک ایسی کھلی ہوئی کتاب ہے جو ہر وقت پڑھی جا سکتی ہے اور ایسی درخشندہ شمع ہے جو ذہن ودماغ کے ساتھ دل میں بھی روشن ہے اور جس کی روشنی سے انکار ناممکن ہے۔ ایک یقین جس کا جھٹلا دینا محال۔ اس کے لیئے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے ۲۸ء سے لے کر ۶۲ء تک کے ملک کے سیاسی الٹ پھیر میں مولانا کی زندگی ایک ایسے موتی کی طرح ہے جسے سمندر کی موجیں بار بار اپنی سطح پر ...... لاتی ہوں۔

جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے لے کر پارلیمنٹ کی کرسیوں تک ایک گونج سنائی دے گی۔ محکمہ کسٹوڈین میں دبے ہوئے سیکڑوں فائل حضرت مولانا کی خدمت پر شہادت دیں گے۔ مغویہ بازیافتہ عورتوں کی نگاہوں میں اپنے محسنِ اعظم کے لیئے ایک جذبۂ عقیدت واحترام حرفِ واضح دکھائی دے گا۔ اور اسی طرح ملک کی بے شمار واگزار مساجد کے محراب ومنبر سے ان کی مجاہدانہ داستان سنی جا سکتی ہے۔ دفتر جمعیۃ العلماء ہند میں ہمہ وقت اپنی اپنی ضرورت لے کر آنے والوں کی خونبار آنکھوں اور شکستہ دلوں سے سوال کیجیئے کہ ان کے زخم کی چارہ گری کرنے والا کہاں گیا۔ آج بجا طور پر علامہ اقبال سہیل کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو گاندھی جی کے بعد مولانا رح کے لیئے صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

تجھے مسجدوں نے دعائیں دیں کہ تیرے کرم سے اماں ملی
تجھے مندروں نے صدائیں دیں کہ تباہیوں سے بچا دیا

غرض یہ بھی ایک ایسا وسیع وعریض میدان ہے جہاں اپنے ذہن وقلم کو تھکا ہوا پاکر عاجز ہونا پڑتا ہے اور رک جانے ہی میں سلامتی نظر آتی ہے کہ یہ کسی شہسوار ہی کا کام ہے۔

آہ۔ آج زندگی کے اُن چند لمحات کا تصور بڑا قیمتی معلوم ہوتا ہے جو مولانا رح کی مجلس میں گذرے اور اکثر مواقع پر کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ سامنے آیا جس سے ان کی کتاب زندگی کا ایک درخشندہ باب کھل گیا۔

مولانا دفتر جمعیۃ العلماء میں تشریف فرما ہیں۔ راجستھان، بہار، جے پور، یوپی، مشرقی پنجاب، حتیٰ کہ پاکستان کے اہل غرض گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک فطری قاعدہ ہے کہ حاجتمند اپنی مقصد برآری میں اسباب کی دشواریوں اور معاملے کی پیچیدگی سے قطع نظر کرکے اپنی منزل کی طرف بڑھنا اور اپنے مقصد کو پانا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کے لیۓ اس وقت بڑی دشواری کا سامنا ہوتا تھا۔ غرض اور طلب کے ایسے ہی دشوار مقام پر مولانا الجھے ہوئے ہیں، اتنے میں ایک صاحب شکستہ حال آگے بڑھتے ہیں اور ایک پرچہ سامنے رکھ دیتے ہیں۔ مولانا رح اُسے پڑھکر اسی پر کچھ تحریر فرما دیتے ہیں اور دوسرے کمرے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں وہاں جاؤ۔

پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ اُس نے مولانا رح سے کچھ روپے طلب کیۓ تھے۔ مجاہد ملت نے حسب عادت مولانا وحیدالدین صاحب کو لکھدیا اور اُنھوں نے عنایت فرما دیۓ۔

مزید پتہ چلا کہ ان کی رقم میں مستقل بجٹ اسی مد کے لیۓ ہے اور یہ سلسلہ برابر رہتا ہے کہ حاجتمندوں کی ایک قسم یہ بھی آتی ہے حضرت مولانا رح کسی کو خالی نہیں لوٹاتے اور اس داد و دہش کا حساب ماہ بماہ اپنے پاس سے دفتر کو ادا کرتے ہیں۔ اس مشاہدے کے بعد دل عقیدت و احترام سے لبریز ہوگیا۔

جامعہ ملیہ نئی دہلی میں جوبلی کے موقع پر میں بھی حاضر ہوا۔ منجملہ دوسرے پروگراموں کے ایک نشست اسلامیات کے موضوع پر لکچروں کی رکھی گئی تھی۔ بڑے بڑے مفکرین اور علماء کا اجتماع تھا۔ علی گڑھ سے ڈاکٹر علیم صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اپنے موقع پر موصوف نے مختصر لفظوں میں چند باتیں فرمائیں۔ اس کے بعد ایک شعر ؎

من ز قرآں مغز را برخواستم ؎ استخواں پیشِ سگاں انداختم

پڑھ کر علماء سے معذرت کرکے بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رح تشریف لائے۔ سننے والوں نے سنا کہ ڈاکٹر صاحب کے اس شعر کا کیسا مدلل اور ٹھوس جواب عنایت فرمایا اور پھر روحِ قرآن پر ایک تقریر کی جو ہر فکر و ذہن کے لیۓ ایک ناقابلِ انکار تفسیر بن کر رہی۔

میں اپنے ایک اہم کام کے سلسلے میں ایک خط لینے کے لیۓ خدمت میں حاضر ہوا، خوش قسمتی سے میرا مقصد حضرت مجاہد ملت رح کی سمجھ میں آگیا۔ بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور دوسرے دن صبح کو دولتکدہ پر چائے کے لیۓ فرمایا، میں حاضر ہوا تو چائے کے بعد پورا خط اپنے ہاتھ سے تحریر فرماکر دستخط فرماکر عنایت کیا۔ جو میرے لیۓ اب ایک متاع بے بہا ہے۔

اب مولانا رح کہاں ہیں۔ دل روتا ہے۔ آنکھیں ترستی ہیں۔ اب تو یاد ہی یاد ہے اور لب پر دعاء۔ الٰہی تو ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ اپنے مقرب بندوں میں شمار کرلے۔ اپنی رحمتِ بے پایاں سے نوازدے مولانا مرحوم کے پسماندگان کو جن کا حلقہ اہل خانہ سے لے کر قوم و ملت تک وسیع ہے صبر و تحمل عطا فرمادے اور قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

عکسی قرآن مجید معرّیٰ

مجاہدِ ملت کی آخری معرکۃ الآرا تقریر

مؤرخہ ۵ رمضان سنہ ۱۳۸۰ھ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۶۱ء

"میں کہتا ہوں کہ جو کچھ آج میں یہاں کہہ رہا ہوں وہی وہاں (جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس اجین) میں کہا گیا۔ میں اس باڈی کا ذمہ دار ہوں، میں ان تجویزوں اور تقریروں کے لئے ذمہ دار ہوں۔ ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف یا سیکولرازم کے خلاف نہیں کہی گئی۔ وہاں یہ شکایت کی گئی کہ مسلم اقلیت کو دبایا جا رہا ہے۔ فرقہ پرستی اُبھرتی آ رہی ہے، جو کچھ کہا گیا ہے ٹھیک کہا گیا ہے۔ اگر آج ان باتوں کے حق میں سیٹھ جی یا دوسرے ہندو بھائی نہیں بولتے تو پھر مجبور ہوکر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ فرقہ پرستی اُبھر رہی ہے اور حکومت بے بس ہے۔ درسی کتابوں میں عقائد کی توہین برداشت نہیں کی جا سکتی۔"

چین اور ہندوستان کی سرحد

جہاں تک چین اور ہندوستان کا معاملہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق مختلف طریقوں سے ہاؤس میں دوسرے وقت بھی بحث ہوئی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں دو رائیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ چین جس کے متعلق ہندوستان نے ہر موقف پر ٹھہراؤ اور ہر موقع پر پورے طریقوں سے اس کا ساتھ دیا اس چین نے چین کی حکومت نے موجودہ چین کی کمیونسٹ حکومت نے ہندوستان کے ساتھ بے وفائی کی، اور انتہائی شرافت سے گری ہوئی زندگی کا ثبوت دیا۔

جہاں تک بارڈر کا مسئلہ ہے ہماری حد ایک لمبی لکیر ہے میکماہن لائن اور اس طرف کشمیر کی وہ حدود ہیں جو کہ اس ملک کی سرحد تک ہیں۔ چین کی طرف سے بار بار ان کے بارے میں چھیڑ کی جاتی ہے۔ ایسے قدم اُٹھائے جاتے ہیں جس سے ہندوستان کے مقصد اور کاز کو نقصان پہونچے ان حدود کو مغلوں کے زمانہ سے آج تک بغیر کسی اختلاف کے ہندوستان کی حدود مانا گیا ہے۔ آج ان کے بارے میں بحث کرنا اور ہندوستان کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنے کی کوشش کرنا اور جس حصہ پر اس نے ناجائز قبضہ کیا ہے اس کو اپنے ملک کا حصہ بتانا یہ ایسی چیزیں ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ دنیا میں، دنیا کی زندگی میں جب اخلاق نہ ہو، روحانیت

نہ ہو۔ صرف مادیت ہی مادیت پیش نظر ہو تو جتنا بھی کچھ ہو وہ کم ہے۔

حکومت ہند کی پالیسی

ایسے موقع پر اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو ہم جنگ کریں یا دوسرے طریقوں سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ آج ہمارے پرائم منسٹر اور ہر ایک عقلمند آدمی یہ سوچتا ہے کہ آج کے زمانہ میں یہ جنگ ساری دنیا کی جنگ ہوسکتی ہے اور بڑی بڑی تہذیبیں برباد ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے طریقہ سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ گورنمنٹ کی اس پالیسی کو ہم سپورٹ کرتے ہیں اور پورے طریقہ سے اتفاق رائے کرتے ہیں کہ وہ اس طرز پر چل رہی ہے کہ ایک طرف وہ مضبوط ہے کہ ایک انچ زمین بھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جانے دے گی اور دوسری طرف اُس نے ارادہ کر رکھا ہے کہ اگر کسی ملک کی طرف سے ...... جارحانہ کارروائیاں ہوئیں تو ان کا سامنا کیا جائے گا۔ اور جو کارروائیاں اس سلسلے میں ہو چکی ہیں اُن کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کانگو کا مسئلہ

باہر کے معاملات کے سلسلہ میں کانگو پر بحث ہوئی ہے۔ بے شک وہ ایک مظلوم قوم ہے اور مظلوموں کا ساتھ دینا ہمارا شیوہ، ہمارا شعار اور ہماری عادت ہے۔ ہم برابر ایسا کرتے رہے ہیں۔ اور آج بھی کانگو کے معاملہ میں ہم اسی طرف ہیں۔ جہاں پبلک کا رجحان ہے وہاں بریلجیم کی طرف سے کالونیلزم کا جو غلط، بھیانک اور گھناونا مظاہرہ کیا جارہا ہے وہ ناقابل برداشت ہے وہاں پر ایک فارین (بیرونی) طاقت نے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے کو تباہ کروانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں مسٹر لومبا اور ان کے کچھ ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

اپنے ملک کا معاملہ مدھیہ پردیش کے واقعات

ان باتوں کے متعلق فائیو ایر پلان کے متعلق اور پنچایت راج کے متعلق کہنے کے لیے بہت سے موقع ہیں کہا جاتا رہے گا۔ لیکن ایک بحث خود بخود ہاؤس کے سامنے آگئی ہے اور آنی چاہیے تھی۔ میں بھی اس پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات پر مایوسی ہوئی کہ ۳ر تاریخ سے لے کر ۹ر تاریخ تک جبل پور، کٹنی، ساگر، دموہ، نرسنگھ پور، سروپا اور کتنے ہی مقامات پر فسادات ہوئے اور بربادی ہوئی، آگیں لگیں، مکان برباد ہوئے اور دوکانیں جلائی گئیں اور جان و مال کا نقصان ہوا لیکن ۱۴ر تاریخ کو پریذیڈنٹ صاحب کا جو ایڈریس آتا ہے اس میں ایک لائن بھی اس سلسلہ میں ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ اس بارے میں کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے گا جس سے اس قسم کے واقعات پھر نہ ہوں کیونکہ کسی سیکولر اسٹیٹ کے لیے اس سے زیادہ ندامت اور شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہاں سامپردائیکتا (فرقہ پرستی) اس طرح منہ کھولے کھڑی رہے اور شروع سے آخر تک اس کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاری رہے اور ہم اس کو روک نہ سکیں۔

انفرادی واقعہ کو قومی واقعہ بنانے کا ظلم

جبل پور میں ایک واقعہ ہوا۔ ایک انڈیو جول واقعہ۔ ایک انتہائی شرمناک واقعہ ہوا جس کی سزا ذمہ دار شخص کو ملنی چاہیئے لیکن ایکشن اور ری ایکشن کا یہ مطلب کبھی نہیں ہو سکتا کہ انڈیو جول نے ایک بات کی ہو تو پوری کمیونٹی کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ یہ طریقۂ کار کسی طریق سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے بلکہ انتہائی نقصان دہ ہے اس بنا پر یہ بات بہت قابلِ توجہ ہے کہ پچھلے دنوں میں اسی مدھیہ پردیش میں بھوپال میں جو فساد ہوا تھا وہاں پر کسی کو سزا نہیں ملی کسی مجرم کو اس کی خطا پر پکڑا نہیں گیا، کسی غنڈے اور شرارت پسند کو سزا نہیں دی گئی۔ ان حالات میں مختلف مقامات میں فسادات ہوئے ہیں اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کھلے دل سے من مانی کر سکتے ہیں جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔ حکومت ہمارے مقابلہ میں بے بس ہے اور کچھ نہیں کر سکتی اس کے سوا دوسری کوئی بات نہیں ہے۔

ہندو مسلم فساد نہیں ہے غنڈوں کی اسکیم ہے

میں ایمان داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ان فسادات کو ہندو مسلم فسادات کہنا ہندوؤں اور مسلمانوں کی توہین کرنا ہے۔ یہ فساد ہندو اور مسلمان نہیں کرتے۔ میں آپ سے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کی پبلک جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ آج بھی کانوں پر ہاتھ دھر رہی ہے کہ یہ بلا، یہ مصیبت، یہ عذاب کہاں سے نازل ہوا۔ یہ ہندو مسلم فساد نہیں ہے اور ان کو فرقہ وارانہ فساد کہنا بھی غلط ہے۔ غنڈوں اور شرارت پسندوں نے ایک اسکیم بنائی ہے۔ اور اس اسکیم کے ماتحت وہ جب چاہتے ہیں تب فساد کرتے ہیں۔ درحقیقت اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب انکوائری ہوگی تو اس میں یہ بات صاف ہو جائے گی۔

ایڈمنسٹریشن کی مجرمانہ چشم پوشی

ایڈمنسٹریشن نے جان بوجھ کر اس میں چشم پوشی کی یا ماتحت پولیس کے افراد نے ساتھ دے کر بربادی کرانے کی کوشش کی۔ اس وقت حکام نے، لوکل حکام نے، ایڈمنسٹریشن نے اپنی کمزوری بھی دکھائی اور اس سازش میں ان کا حصہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ بقول سیٹھ جی کے (سیٹھ گووندداس) ۳، ۴ تاریخ کو یہ واقعہ پیش آیا تھا اور اس کی روک تھام ہو سکتی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اسپیشل پولیس کے جو دستے بلائے گئے تھے وہ کیوں واپس چلے گئے تھے جس کے نتیجہ میں ۷ تاریخ اور ۸ تاریخ کی درمیانی رات کو اس قدر ہولناک بربادی ہوئی، جان بوجھ کر ایک سائڈ کی اس طریقہ سے بربادی کرائی جائے یہ کسی طریقے سے بھی ہندوستان کے لیئے زیبا نہیں ہے۔ ہم پاکستان اور ایوب خاں کے خلاف اعتراض کریں وہ ہمارا حق ہے کوئی ہمارے معاملہ میں دخل نہ دے۔ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ ہم اپنے ہندوستان میں اپنے معاملات کو حل کر سکتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جان کی بازی لگا کر ساتھ ساتھ شریک ہو کر ملک کو آزاد کرایا ہے جنھوں نے دو نیشن تھیوری کو ماننے کے لیئے جان کی بازی لگائی ہو

اپنوں سے گالیاں کھاتی ہیں۔ جیلیں بھگتی ہیں۔ چاقو کھائے ہیں۔ ان کو آج ان باتوں سے کوئی ڈر نہیں ہو سکتا کہ جب بھی کوئی ایسی فساد کی من مانی بات کی جائے۔ مسلم اقلیت کی تکلیف کی بات آئے تو اخباروں یا تقریروں میں فوراً پاکستان کے حوالے دیدیے جائیں۔ پاکستان ریڈیو کے حوالے دیدیئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس کا پاکستان سے جوڑ تھا۔ اس کا فلاں چیز سے جوڑ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جاسکتا اور اگر اس طریقہ سے حقیقت کو دبانے کی کوشش کیجائیگی تو اس سے ملک کو کوئی لابھ اور فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ ملک کا انتہائی نقصان ہو سکتا ہے۔

یکطرفہ بربادی کیوں؟

اس حالت میں اس بات کا کیا خوف ہے کہ کوئی کیا کہتا ہے اور پاکستان کے ساتھ جوڑنے کا ٹیکنک کیوں اپنایا جاتا ہے ہم اس کے خلاف ضرور آواز اٹھائیں گے۔ کیا ہر جگہ ظلم اور بربادی ہوتی رہے گی اور اگر اس کے بارے میں مسلمان اقلیت کسی بات کو کہے گی تو یہ کہکر اس کا منہ بند کردیا جائے گا کہ پاکستان سے جوڑ ہے۔ پاکستان ریڈیو سے جوڑ ہے۔ اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جاسکتا ہے۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس طریقہ سے ایک اقلیت کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ جبل پور میں دو جانب سے کوئی بات ہوئی ہو مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا پھر یہ بھی بتایا جائے کہ کس طرح ۴ر تاریخ کو ساگر۔ کٹنی، دموہ۔ نرسنگھ پور۔ سروپا اور تمام دیگر مقامات پر ۱۲ سے ۴ بجے تک سازش سے سینکڑوں مکان جلاکر خاک کردیئے گئے۔ کیا پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے موجود ہوتے ہوئے کوئی اس طریقہ سے بربادی کرسکتا ہے۔ اطمینان کے ساتھ پٹرول چھڑکا گیا۔ اطمینان کے ساتھ آگ لگائی گئی۔ بڑی بڑی قلعہ نما عمارتیں خاک سیاہ کردی گئیں۔

اقتصادی مار

ایک ایک انسان کا دس دس بارہ بارہ لاکھ کا نقصان ہوا۔ کالے خاں محمد حنیف کی کوئی معمولی فرم نہیں تھی۔ دس بارہ لاکھ کا اس کا نقصان ہوگیا اس کی بیڑی کی تجارت تھی۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اس کو اقتصادی مار مار کر برباد کردیا۔ فیروز آباد میں چوڑیوں کی تجارت تھی وہاں مسلمانوں کی صنعت و حرفت کو تباہ کیا گیا۔ کیا کچھ فرقہ پرست عناصر نے یہ طے کرلیا ہے کہ اس طریقے سے مسلمانوں کو جو موجودہ اکانومکس اور اقتصادیات سے خود بدحال ہیں اس ملک میں بالکل تباہ کرکے بھکاری اور فقیر بناکر چھوڑ دیں اور یہ حکومت بے بس ہو، بے چارہ ہو اور کچھ کرنہ سکے۔ سب کچھ ہو جاتے تو پھر اس کی انکوائری ہوتی پھرے اور اس کے بعد یہ کرو وہ کرو آخر اتنا بڑا واقعہ ہوکیسے گیا۔ تین ضلعوں میں بارہ جگہ ایسے واقعات کیسے ہوگئے حکومت کو اس پر غور کرنا چاہیئے۔

دِلّی کا واقعہ

مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ ان معاملات میں کب تک تسلسل جاری رہے گا۔ کیا پورے ہندوستان

کو اس میں لپیٹ دیا جائے گا۔ ابھی دو تین دن پہلے دہلی میں بھی یہی تیکنک چلی تھی لیکن وہاں کے ہندو اور مسلمان
ہم لوگ جو وہاں رہتے ہیں ۱۱ بجے رات کو وہاں پہونچ کر تین بجے تک رہے اور ہندو لیڈروں کے ساتھ
جو وہاں موجود تھے اس بات کی کوشش کی کہ اس کو کسی طریقے سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ میں یہ بتانا
چاہتا ہوں کہ جن کے پاس طاقت، شکتی اور مادی پاور نہیں ہے جب وہ اس طریقہ سے اس معاملہ کو حل کر سکتے
ہیں تو ایڈمنسٹریشن حکومت کے افراد لوکل اتھارٹیز اگر چاہیں تو کیا امن قائم نہیں ہو سکتا۔

شرارت پسندوں کی حوصلہ افزائی

مگر حکومت بے بس نظر آتی ہے اور شرارت پسند لوگ جو کچھ چاہیں کر گذرتے ہیں۔ آج سب معاملوں میں
ان کی مخالفت کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ زور شور کے ساتھ پارلیمنٹ میں یہ تو کہا
جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ہو کیا رہا ہے مسلم اقلیت تباہ بھی
ہو رہی ہے اور برباد بھی ہو رہی ہے اور ایکشن اور ری ایکشن کے نام پر شرارت پسند لوگ جو چاہتے ہیں
کرتے جاتے ہیں اس طرح کی باتیں ہونے دینا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ کے لیئے مناسب نہیں ہے اور نہ
ہو سکتا ہے۔

زندگی کے مختلف پہلو اور مسلم اقلیت کا حال

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ مسلم اقلیت کا ملازمتوں میں کیا حال ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کی انکوائری کی
ہے کہ ان میں اقلیتوں کو کیوں نہیں لیا جا رہا ہے۔ کیا اقلیتوں کے جتنے بھی بچے ہیں مسلمانوں، سکھوں اور
عیسائیوں کے جتنے بھی بچے ہیں وہ اتنے نالائق ہو گئے ہیں کہ ان کے لیئے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ اسٹیٹ
گورنمنٹس کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں گورنمنٹ آف انڈیا کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں۔ بتایا جائے کہ ان پچھلے چوڈ
برسوں میں اقلیتوں کے کتنے لڑکے نوکریوں میں لیئے گئے ہیں۔ پہلے تو ان کو انٹرویو میں ہی نہیں بلایا جاتا
اور اگر بلایا بھی جاتا ہے تو ان کو جگہ نصیب نہیں ہوتی ہے۔ وہ تباہ اور برباد ہو رہے ہیں۔ میں یہ مانتا
ہوں کہ یہ رزویشن کا سوال نہیں ہے لیکن اگر کوئی ایسے حالات میں رزولیشن کی بات کہتا ہے یا رزویشن
کی بات کو اٹھاتا ہے تو اسے فرقہ پرست کہا جاتا ہے اور اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس نے رزویشن
کا لفظ کیوں کہہ دیا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیکولر اسٹیٹ کے وہ لوگ کیا فرقہ پرست نہیں ہیں جو نہ یہ
چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ملازمت میں لیا جائے اور ان کو تباہ و برباد کیا جائے۔ ان کی اقتصادیات
اور ان کے طریقہ زندگی کو ختم کیا جائے۔ آج مسلم اقلیت کو بھی یعنی ایک کیمونٹی کو دبانے کے لیئے نہ
ملازمت میں لیا جاتا ہے نہ تجارت کرنے دیا جاتا ہے اور نہ ان کو اپنی اقتصادی زندگی جاری رکھنے
کا حق دیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی جو شہری زندگی ہے جو امن کی زندگی ہے۔ اس تک کو بھی دینے کے لیئے
وہ تیار نہیں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ بھی کوئی فرقہ پرستی دوسری ہو سکتی ہے
اس کا کیا مطلب ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اکثریت کے سبھی لوگ برے ہیں۔ اس میں سے تھوڑے برے ہیں

اس میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں ہے ہندو مسلمان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دونوں گلے ملنے کو تیار ہیں۔ لیکن چند شرارت پسند لوگ اکثریت میں ایسے ہیں جو کہ اقلیتوں کو اس طرح سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں اگر ان کی ہاؤس میں بھی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جائے تو کیا ہوگا کیسے کام چلے گا۔ کیسے ہماری اسٹیٹ سیکولر اسٹیٹ بن سکے گی۔ آخر سیکولر اسٹیٹ کا مطلب کیا ہے صرف سیکولر اسٹیٹ کہہ دینے سے وہ سیکولر اسٹیٹ نہیں بن جاتی اس کا مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی جو زندگی ہے اس کو بسر کرنے کا سبھی کو حق حاصل ہو سبھی کو پانے کا حق حاصل ہو، تجارت کرنے کا سب ہی کو حق حاصل ہو۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ اقلیتوں کو آج نوکریاں نہیں ملتی ہیں۔ ملک کی اقتصادیات میں، تجارت میں پرمٹ نہیں ملتے۔ فایو ایر پلان میں کو اپریٹو سوسائٹیز کو جو جگہ ملی ہوئی ہے اس کے بارے میں ان کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

نصاب کی کتابیں

اسی طرح ٹیکسٹ بک کی کتاب ہے اس کے بارے میں ہم نے شکایت کی تھی اور وزیر تعلیم کو ایک کتاب دکھائی تھی اور انھوں نے ہماری بات کو صحیح تسلیم کیا تھا اور کہا تھا کہ اس قسم کی کتابیں نہیں پڑھانی چاہیئں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تیوہاروں کا ان میں کیوں ذکر کیا گیا ہے دیوالی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ دسہرہ کا کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب ہندوستان کے تیوہار ہیں کسی کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن جہاں اکثریت کے تیوہار کا ذکر ہے وہاں مسلمانوں کے جو تیوہار ہیں، عید ہے۔ بقرعید ہے۔ شب برات کیا ہے۔ محرم کیا ہے یا سکھوں کے تیوہار ہیں عیسائیوں کے تیوہار ہیں ان کا بھی ان میں ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ اگر یہ کیا گیا ہوتا تو سیکولر اسٹیٹ کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا لیکن اس کے بر خلاف اس طرح کی باتیں ان کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ آؤ بچو بھگوان کرشن کی پوجا کریں۔ آپ بتائیں کہ مسلمانوں کے بچے یہ کیسے کریں گے۔ بھگوان کرشن کی پوجا ہندو کر سکتے ہیں لیکن مسلمان، سکھ، عیسائی کیسے کر سکتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی چیزیں پڑھانے کا اقلیتوں کے بچوں کو آپ کو کس نے حق دیا ہے۔ مسلمان اپنے خداوند قدوس کی عبادت کرتے ہیں۔ سکھ اپنے طریقہ سے کرتے ہیں۔ عیسائی اپنے طریقہ سے اور ان کو اس کا پورا حق حاصل ہے آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ آپ دوسرے مذہبوں کی توہین کریں خدا اور رسول کی توہین کریں اور یہ پرچار کریں کہ وہ سب اس طرح کی چیزوں کو پڑھیں۔ آپ کو نہیں چاہیئے تھا کہ آپ کتابوں میں اس طرح کے مضامین لکھواتے اور اس طرح کی کتابوں کو ٹیکسٹ بکس میں جگہ دیتے مگر ٹیکسٹ بکس کمیٹی نے یہ کیا اور اس نے اس طرح کی کتابوں کو جگہ ہمیں معلوم ہے کہ محض بعض رشتہ داروں سے بعض جاننے والوں سے اس طرح کی چیزیں لکھوادیں جو اگرچہ تعصب کی بنا پر نہیں لکھی گئیں۔ تنگ نظری کی بنا پر نہیں لکھی گئیں بلکہ ناواقفیت کی بنا پر لکھی گئی ہیں۔ میں نے ایک لکھنے والے سے اس کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ میں اسلام کے بارے میں جانتا نہیں تھا اس لیۓ ایسا ہی لکھدیا ہے چونکہ ٹیکسٹ بک کمیٹی میں کسی کا کوئی رشتہ دار آگیا تو اس کی سفارش سے یہ کتاب ٹیکسٹ بک میں آگئی۔ ایسی کتابیں نہیں آنی چاہیئں اور اس طرح کی چیزوں کو اس میں جگہ نہیں ملنی چاہیئے اور اس طرح کی چیزوں کے خلاف ہم بولیں گے۔ سیکولر اسٹیٹ کے اندر اس قسم کی کتابیں، خاص طور

پر بیسک ایجوکیشن کے اندر اور پرائمری تعلیم کے اندر ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہئیں نہیں پڑھائی جانی چاہئیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس اجین

سیٹھ جی نے جمعیۃ علماء ہند کے بارے میں کہا کہ وہ بہترین باڈی ہے اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے لیکن اجین میں ایسی تقریریں ہوئی ہیں جن کو پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ میں آج یہاں کہہ رہا ہوں وہی کچھ وہاں کہا گیا ہے میں اس باڈی کے لیے ذمہ دار ہوں۔ میں اس کی تجویزوں اور اس کی تقریروں کے لیے ذمہ دار ہوں۔ ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف سیکولرازم کے خلاف نہیں کہی گئی ہے وہاں پر یہ شکایت کی گئی ہے کہ مسلم اقلیت کو دبایا جارہا ہے فرقہ پرستی اُبھرتی جارہی ہے اور حکومت بے بس ہوتی جارہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں کہنے میں کون سی اعتراض کی بات ہوسکتی ہے جو کچھ کہا گیا ہے ٹھیک کہا گیا ہے۔ ان باتوں کے لیے اقلیت کے حق میں اگر آج سیٹھ جی نہیں بولتے ہیں تو پھر مجبور ہوکر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اکثریت خود ان چیزوں کو کہتی اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اقلیتیں تکلیف میں ہیں اُن کی یہ مجبوریاں ہیں وہ بے بس ہیں تو پھر اس پر کیوں اعتراض ہوتا ہے۔ بہرحال اس طرح کی چیزوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

انکوائری کا مطالبہ

بے شک اس کی ضرورت ہے کہ انکوائری ہو اور ہائی لیول انکوائری ہو، اگر ایڈمنسٹریشن میں کچھ لوگ اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے کوتاہی کی ہے تو ان کو سزا ملنی چاہیئے۔ آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیلیور ہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک کے جو واقعات ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیئے کہ اُسے کوئی حق حاصل نہیں ہے حکومت کرنے کا۔ اس طریقہ سے تباہ کرکے، کرش کرکے، برباد کرکے، ہمیں یہاں رکھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

میں اسپیکر صاحب اور ڈپٹی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ کوئی قانونی پوزیشن ایسی لائیں جس سے آسام اور بنگال کے معاملات پر لسانی فسادات کی بنا پر جب یہاں بحث ہوسکتی ہے۔ پارلیمنٹری ڈیلیگیشن وہاں جاسکتا ہے۔ ویسے ہی مدھیہ پردیش کے فسادات کے بارے میں بھی بحث ہو۔ پی، ایس پی نے، جمعیۃ علماء نے، کمیونسٹ پارٹی نے، کانگریسی افراد نے، سبھی نے مانا ہے کہ بہت بڑی تباہی آئی ہے تین ضلعوں کے مختلف حصوں میں۔ اس پر بحث ہونی چاہیئے اور کھل کر بحث ہونی چاہیئے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر بحث ہو تو صفائی کے ساتھ سارے معاملات سامنے آئیں گے۔

پاکستان کا حوالہ بے معنی

جو تجویز بھگت درشن جی نے پیش کی ہے اس کی تو میں تائید کرتا ہوں، لیکن جن معاملات کا میں نے ذکر کیا ہے اُن کے بارے میں پھر سے کہتا ہوں کہ پاکستان کا حوالہ دے کر آپ بچ نہیں سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ پاکستان

مشرب دیوبند۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶۲ء

کے ساتھ ان کا تعلق ہے، کام چل نہیں سکتا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ناگپور ٹائمس میں یہ لکھا ہے مگر کیا آپ نے اسٹیٹسمین میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ ہندوستان ٹائمز میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے، ٹائمس آف انڈیا میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ اس کو بھی پڑھتے، جنھوں نے کہا ہے کہ صرف ایک سائڈ ہی کو برباد کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہاں کوالیکٹو فائنز لگتے، جس طرح کی وارداتیں ہوئی ہیں ان کو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ طریقہ زندگی کا نہیں ہے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنوں میں سیکولرزم کو لانا ہوگا۔ گاندھی جی کے بتائے ہوئے اخلاقی معیار اور نیشنلزم کو لانا ہوگا۔ میں نہیں کہتا ہوں کہ اکثریت میں سبھی لوگ برے ہیں۔ اکثریت میں جو فرقہ پرست ہیں وہ جو کارروائی چاہیں کریں۔ من مانی کریں۔ خوش رہیں اور جو مسلمان اقلیت میں ہیں یا دوسری اقلیتیں ہیں ان کو ہمیشہ ہی دبانے کی کوشش کریں اور پاکستان کا حوالہ دے کر اس کو ایک تیکنیک کے طور پر استعمال کر کے اس قسم کی حرکتیں وہ کرتے جائیں اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا ..... ہم اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہاؤس برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ سب ہی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ صحیح معنی میں یہاں پر سیکولرزم قائم ہو۔

(۲۱ر فروری سنہ ۱۹۶۱ عیسوی مطابق ۵ر رمضان ۱۳۸۰ھ)

مجاہد ملتؒ کی وفات پر اکابر ہند کے تاثرات

از کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی
(فاضل دیوبند)

محمد عثمان فارقلیط ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی

وہ بلبلِ خوش نوا جس نے کبھی خاموشی اختیار نہیں کی۔ جو دوستوں کے ہجوم میں جلسوں اور کانفرنسوں کے ہنگاموں میں پارلیمنٹ کے ایوانوں میں وزراء کی محفلوں میں، سیرت کے مبارک اجتماعات میں ہمیشہ چہچہایا وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ تھا کہ کینسر کا یہ موذی مرض ایک نہ ایک دن جان لیوا ثابت ہوگا مگر یہ خیال بھی نہ تھا کہ دوست واحباب سے باتیں کرتے کرتے صبح صادق کے وقت یہ صادقوں کا صادق اور عالم قائم بالحق قفس عنصری سے نجات پا جائے گا۔ علاج معالجہ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ بمبئی علاج ہوا۔ دہلی کے ماہر اطباء اور ڈاکٹروں نے پوری توجہ سے طبی امداد پہنچائی۔ امریکہ کے سب سے بڑے ہسپتال میں جہاں خصوصی طور پر کینسر ہی کا علاج ہوتا ہے داخل ہوئے اور کئی ماہ تک بڑے بڑے ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے مگر کینسر سے افاقہ نہ مل سکا اس مردِ مجاہد نے پوری ہمت اور قوت کے ساتھ بیماری کا مقابلہ کیا آخر دم تک دماغ کارفرما رہا اور روح بشاش رہی لیکن آخر کب تک لن یوخر اللّٰہ نفسًا اذا جاء اَجَلُھَا آخر وہ وقت موعود آپہونچا جو ہر جان کے لیے مقدر ہے اور وہ کھڑکی کھلی جس سے شاہ وگدا امیر وغریب کمزور و توانا اچھے اور بُرے کو گذرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مردِ مجاہد پر اپنی بیکراں رحمتوں کی بارش فرمائے۔ آپ کی زندگی کو اگر انقلابی زندگی قرار دیا جائے تو اس میں شمّہ برابر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ آزادی سے پہلے بھی سیماب وار متحرک رہے اور آزادی کے بعد کے عمل وتحرک پر تو زمین وآسمان گواہی دیں گے۔ ابھی کلکتہ میں ہیں دہلی پہنچے۔ بمبئی کے تار پر بمبئی روانہ ہوگئے۔ وہاں ٹیلیفون پہنچا اور ہوائی اڈہ پر کھڑے نظر آئے۔ دہلی آئے بستر رکھا اور آنے والوں سے ملاقات کی۔ صبح کی نماز سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک زندگی کا ایک ایک لمحہ مصروف رہتا تھا۔ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس مرد مجاہد کا کوئی بدل نہیں۔ امت متعدد بار یتیم ہوئی مگر اب کی یتیمی کا احساس زائل نہیں ہوگا۔

مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کا یہ عظیم ترین المیہ کسی ایک فرد یا خاندان یا ایک شہر اور ایک ملک کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا صدمہ ہے۔ مولانا کی ذاتِ گرامی اپنی قابلیت اور مقبولیت کے لحاظ سے بلاامتیاز مذہب ہندوستان گیر شخصیت تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی چار دیواری میں ان کی علمی استعداد اور فکری نشو ونما کا آغاز ہوا، فراغت کے بعد اکابر نے مولانا کی قابلیت کی رفعت مندانہ کیفیت کو دیکھکر آپ کو دارالعلوم

میں معین المدرس کی خدمت سپرد فرمائی نتیجہ توقع کے مطابق ہوا کہ مولانا نے دارالعلوم کی ممتاز تدریس میں بہت جلد اکابر کی نظروں میں اعتماد اور طلبہ کی نظروں میں محبوبیت ومقبولیت پیداکرکے بلندترین مقام پیداکیا اور اس کے بعد دارالعلوم میں آپ کا پورا زمانۂ قیام اسی مقبولیت اور امتیاز کے ساتھ بسر ہوا۔ پرنام بٹ مدراس کی دینی درسگاہ سے امتیازی اوصاف تدریس رکھنے والے بلند فکر عالم کے لیے خصوصی طلب کی بناء پر آپ پرنام بٹ مدراس تشریف لے گئے اس کے کچھ عرصہ بعد اپنے محبوب اساتذۂ کرام کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں خدمت تدریس انجام دینے کی نوبت آئی۔ علمی اور تدریسی ذوق کے ساتھ مولانا سیاسی دماغ بھی رکھتے تھے۔ آپ کی سیاسی خدمات کا آغاز جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ہوا تھا۔ یہاں آپ نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے فکرِ رسا، معاملہ فہمی، وقت شناسی، اور استقلال وثبات قدمی کا لوہا منوالیا جس کے نتیجہ میں آپکو ورکنگ کمیٹی میں لیا گیا اور پھر آپ کی پرتاثیر شخصیت نے اپنا واجب خراج اعتراف اس طرح وصول کیا کہ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس لاہور میں آپ کو متفقہ طور سے ناظم اعلیٰ بنادیا گیا۔ اس ذمہ دارانہ منصب کے ساتھ آپ کی ذمہ دارانہ خدمات کا آغاز بھی تھا اور ساتھ ہی ایک غیر معمولی امتحان بھی۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گذرنے پایا تھا کہ آپ کی مدبرانہ روش اور زعیمانہ صلاحیتیں بروئے کار آگئیں اور سیاسی رہنمائی میں ملک گیر انداز پر آپ صف اول کے لیڈروں میں پہنچ گئے۔ برطانوی عہد میں آپ کو اپنی رہبرانہ صلاحیتوں کی قیمت قید وبند کی صورت میں اداکرنی پڑی اور بالآخر اپنے ہمعصر صفِ اول کے زعماء کے دوش بدوش جنگ آزادی لڑکر وطن کو آزاد کرایا۔ لیکن وقت کو یہ منظور نہیں تھا کہ آپ کا جہادِ فکروعمل ختم ہو۔ ۱۹۴۷ء میں آفتاب آزادی طلوع ضرور ہوا لیکن اس کا افق خونی شفق سے رنگین تھا اور ایک شہر سے دوسرے ہی نہیں بلکہ قاسم جان اسٹریٹ سے لال قلعہ تک جانے کے لیے بھی خاک وخون میں تڑپتی ہوئی لاشوں کو عبور کرنا ناگزیر تھا۔ یہ مجاہد ملت ہی کا مردانہ حوصلہ تھا کہ اس قتل وغارت گری کے پُرآشوب دور میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر قیام امن کے سلسلہ میں سرفروشانہ حصّہ لیا اور اپنی بے مثال سعی کے نتیجہ میں لاکھوں انسانوں کی جانوں اور مالوں اور آبروؤں کے محافظ بنے اور خطرناک منزل پر بھی اپنی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھی۔ غرض کہ مجاہد ملت کی زندگی ہر حیثیت سے ناقابلِ فراموش ہے۔ آج دارالعلوم اور اس کی جماعت اپنے اس جلیل القدر فرزند کی دائمی جدائی پر سوگوار ہے۔ آج مظلوم اپنے پشت وپناہ کے اٹھ جانے سے رنجیدہ ہیں آج ملک کے اہل علم ایک صاحب بصیرت اور بالغ نظر عالم کے رخصت ہونے پر افسوس کررہے ہیں۔

آخر میں مولانا مرحوم کے متعلقین اور اعزاء کی خدمت میں اپنی شرکتِ غم کے ساتھ تعزیت مسنونہ اور تلقینِ صبر کی عرضداشت اور اجر جزیل کی دعاء پیش کرتا ہوں۔

مسٹر ڈی سنجیویا صدر کانگریس

مولانا آزادی کی تحریک میں صف اول کے رہنما تھے، انھوں نے ہندوستان میں یک جہتی کے لیے اور خصوصًا مختلف فرقوں میں اتحاد کے لیے زبردست کوشش کی جب دو فرقوں میں تعلقات خوشگوار نہ تھے تو وہ حالات کی اصلاح کی جدوجہد میں سب سے آگے رہے انہوں نے ہر موقع پر خلوص ومحنت سے

کام کیا۔ جمعیۃ العلماء سے ان کا تعلق سبھی کو معلوم ہے۔ کانگریس مین کی حیثیت سے انہوں نے جو کچھ کیا وہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔ مجھے ان کے ساتھ زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا۔ میں انھیں ایک عظیم لیڈر سمجھتا ہوں جو نہایت اچھی اور سادہ زندگی گذارتے تھے۔ میں نے ان سے ایک اہم معاملہ پر گفتگو کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ:۔

"سنجویا صاحب خدا پر بھروسہ رکھو، صحیح کام کرو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو"

اس موقع پر کوئی شخص ایسا نہیں جو ان کا ماتم نہ کرے، خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

چودھری برہم پرکاش ایم۔پی

ایک ایک کرکے ہمارے بزرگ جنھوں نے ہمیں راہ دکھائی، ہم سے جُدا ہورہے ہیں یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ہماری نسل پر اور آنے والی نسلوں پر حضرت مولانا نے کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ میرا اور اُن کا بہت قریبی تعلق ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا۔ ان دنوں حالات بہت خراب تھے ہم نے ان دنوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا۔ جب اس دور کے واقعات یاد آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ کتنا بڑا آدمی ہم سے جُدا ہوگیا۔ آج ہم خود کو کمزور پاتے ہیں۔ ان کی خصوصیت بُردباری، محنت اور سمجھداری تھی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے سیاست کی جو رفتار تھی اس کا مقابلہ کرنا انہی کا کام تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے کام کرتے تھے۔ وہ عالموں میں عالم تھے اور عام لوگوں میں بالکل ایسے بن جاتے کہ وہ انھیں اپنا سمجھتے تھے اپنا دکھ درد ان سے بیان کرتے تھے۔ ایسی خاصیت کے لوگ کم ہوتے ہیں ہمارا ایک عالم ایک ساتھی ایک دوست ایک مددگار ہم سے جدا ہوگیا۔ خدا ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے اور ان کا ادھورا کام پورا کرنے کی توفیق دے ہمیں بھی ان کا علم، سادگی اور ہمت عطا ہو۔

نورالدین احمد میئر دہلی

مجاہد ملت مرحوم اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن دل کو اس کا یقین نہیں آتا۔ ان کا مسکراتا چہرہ اور ان کی زیرلب مسکراہٹ آنکھوں میں اس طرح پھرتی ہے جیسے کہ مولانا سامنے کھڑے ہوں۔ مولانا کی گفتار کی خصوصیت یہ تھی کہ کوئی ان کا کیسا ہی مخالف ہو ان سے گفتگو کے بعد مخالفت دل سے نکل جاتی تھی۔ اپنی سیاسی زندگی میں حضرت مولانا نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ مسلم لیگ کی فرقہ پرستانہ تحریک کا انھوں نے جس طرح مقابلہ کیا اس کے لیئے مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ پورے ملک کو ان کا شکرگذار ہونا چاہیئے۔ اس زمانہ میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔ مولانا نے جس طرح جمعیۃ العلماء ہند اور قوم پرور مسلمانوں کی طرف سے متحدہ قومیت کی حمایت اور فرقہ پرستی کی مخالفت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو اس کا اثر دہلی پر بھی پڑا۔ مولانا نے جس طرح اس وقت حالات کا مقابلہ کیا اور جس طرح ملک کی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی خدمت کی وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے ہر قیمت اور ہر حالت میں یک جہتی اور قومی اتحاد کو بچایا۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں مجاہد ملت

گذشتہ پندرہ برس میں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیئے نہ پہنچے ہوں۔ مجاہد ملّت کی وفات پر کوئی دل ایسا نہیں جو رنج سے خالی ہو، کوئی آنکھ نہیں جو نم نہ ہو۔ میں مجاہد ملت کے لیئے مغفرت اور درجاتِ عالیہ کی دعا کرتا ہوں۔

مولانا شاہد فاخری

مولانا اپنی جوانی کی ابتداء سے کانگریس کے انتھک ورکر اور فدائے وطن رہے۔ پھر تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں اکابر جمعیۃ العلماء نے مولانا کو جمعیۃ کی طرف دعوت دی۔ مولانا پورے خلوص کے ساتھ جمعیۃ العلماء میں شریک ہوئے اور اس کی قربانیوں کی تاریخ میں چار چاند لگادیئے۔ مولانا کا بہت زیادہ وقت کانگریس کی جدوجہد میں صرف ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد کافی توجہ جمعیۃ کی تنظیم کی جانب کی اور اس راستہ سے بھی وطن کی بے مثال خدمت انجام دی۔ سیاسی اختلافات نے مسلمانوں میں جو شدت اختیار کرلی تھی اور مخالفت کی جو غلط روش چل پڑی تھی مولانا نے اس کا بھی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ تقسیم کے بعد پریشان حال مسلمانوں کا اگر ایک طرف بنیادی سہارا تھے تو دوسری طرف پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے بہترین مددگار تھے۔ غرض مولانا کی ساری عمر ایک طرف وطن کی خدمت میں اور دوسری طرف مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی رہنمائی میں صرف ہوئی۔ مولانا کی موت سے ہندوستان کو ایک بے مثل رہنما سے محروم ہونا پڑا۔ مولانا جمعیۃ العلماء کی روح تھے اُس کی جان تھے۔ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے اور ملک وملت کو کوئی نعم البدل بخشے۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی

مولانا کی جدائی ملکی اور ملی حادثہ کے علاوہ میرے لیئے ایک ہولناک شخصی حادثہ بھی ہے۔ گذشتہ بیالیس سال سے ہمارے تعلقات اتنے گہرے وسیع اور پرخلوص تھے کہ ان کا بیان الفاظ کے قالب میں نہیں سما سکتا۔ ایسے روابط کی مثالیں بے شبہ کمیاب ہیں۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء تحریک ترک موالات اور آزادی کی جدوجہد کے ہنگامہ خیز سال تھے۔ ہم دونوں ایک ہی وقت میں استخلاصِ وطن کی اس تحریک میں شامل ہوئے اور اس مقدس اجتماعی تقریب سے ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوگئے کہ یہ تعلقات بہت جلد اخوت اور مودت کے نہایت عمیق رابطہ میں ڈھل گئے ایک ساتھ بڑھے، ایک ساتھ بڑھاپا اور زندگی کی ہر منزل میں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح رفاقت رہی کہ فرقِ من وتو ہی باقی نہ رہا۔

اس وقت بیالیس سال کی اس لطیف ونفیس رفاقت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم رہا ہے اور بے شمار واقعات حافظہ کی لوح پر ابھر رہے ہیں۔ مرحوم عظیم سیاست داں، زبردست عالم دین، اعلیٰ درجہ کے مصنف اور بے مثال خطیب تھے۔ عزم وہمت اور بے باکانہ جراُتِ حق میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بے لوث خدمتِ خلق ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز بلکہ خاص مشن تھا اور دن رات اسی کام میں لگے رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب

سے پہلے مسلم فرقہ پرستی کا اور اس انقلاب کے بعد ہندو فرقہ پرستی کا انہوں نے جس ہمت و جرأت اور حکمت و دانائی سے مقابلہ کیا اس میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں۔ ان کی بے پناہ خدمات اور غیر معمولی قابلیت کا ملک کے تمام ہی طبقوں میں غیر معمولی اثر تھا۔ وہ مظلوموں اور بے سہاروں کی پناہ گاہ تھے۔ جہاں تک جمعیۃ العلماء ہند کا تعلق ہے اس کے یتیم ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ ایسی جامع کمالات شخصیت کا بدل اب مشکل ہی سے مل سکے گا قومی اور ملی تعمیر کے ہر مرحلہ پر ان کی یاد بُری طرح ستائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس ہمدم دیرینہ اور غمگسار کی دائمی جدائی کا غم سہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

کمیونسٹ لیڈر خان شاکر علی خان

آج ہند نے اس بے بہا گوہر کو کھودیا جس کی یاد ہمیں مدتوں تڑپاتی رہے گی۔ مولانا نے زندگی بھر ملک و قوم، مسلم فرقہ اور اردو زبان کے تحفظ کے لیئے زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے گذشتہ سال مسلم کونشن اس مقصد سے بلایا تھا کہ جو دکھ درد اور حق تلفیاں مسلمان محسوس کرتے ہیں ان کا حل تلاش کیا جائے۔ آپ ہندو مسلمان کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے اور قوم کو متحد کرنے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کے لیئے ہر موقعہ پر موجود ہوتے تھے۔

قطعۂ تاریخ وفات

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ

حفظ رحماں، وہ زعیم قوم جب رخصت ہوا
ہر طرف رنج والم کی اک گھٹا سی چھا گئی

میں نے بافسوس فہمی یہ لکھی تاریخ غم
ایک شمع رہ گئی تھی ہائے وہ بھی بجھ گئی

۱۱۷۵ + ۲۰۷ = ۱۳۸۲ ہجری

پیش کردہ :-

جناب فہمی دیوبندی

آج کیا بات ہے

اشرف سعودی باقوی متعلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

آج کیا بات ہے خموش ہیں سب
ملک ہے کیوں مثالِ بیتِ حُزن

آسماں دم بخود، زمیں حیراں
گل ہیں افسردہ سوگوار چمن

حفظِ رحمٰن اس جہاں سے گئے
جس سے سونی ہے بزمِ گنگ وجمن

ہاتفِ غیب کی صدا آئی
نہ رہا لعلِ شب چراغ وطن
۱۹ ۶ ۲۲

سن اے مجاہدِ ملت کی روحِ خلد مکاں — تری تلاش میں خاکِ وطن ہے سرگرداں
بلاکشِ غمِ فرقت کی اشکباری کو — نہ پوچھ دیدۂ اسعد کی بے قراری کو
ہے فخرِ دیں کی نظر خونچکاں خدا کی قسم — ہیں نقشِ یاس محمد میاں خدا کی قسم
وحید اشک فشاں بقرارِ درد حسام — عتیق شعلہ بجاں ہیں فقیہہ سوز تمام
انیس پیکرِ احساس نامرادی ہے — نظر کے سامنے اب تلخیوں کی وادی ہے
فسانۂ غمِ مزدور کہہ رہا ہے کوئی — حدیثِ کربِ جبل پور کہہ رہا ہے کوئی
ضیا کی آنکھ میں ماضی کا نورِ عین کہاں — جو تو نہیں دلِ سید حسن کو چین کہاں
الم نصیبیِ اخلاق کا سماں توبہ — محیطِ قلب و جگر ہے غمِ جواں توبہ
عزیزِ کشتۂ صد غم پکارتا ہے تجھے — جواب دے ترا اسلم پکارتا ہے تجھے
انھیں پہ قافلۂ ابتلاء نہیں محدود — ہر ایک گوشۂ عالم میں ترا غم موجود
اسیرِ دامِ حوادث ہے فکرِ ابراہیم — کرے تو کسپہ کرے دولتِ الم تقسیم
وہ دیکھ کوئی مصیبت زدہ بلاتا ہے — فسانۂ ستمِ زندگی سناتا ہے
وہ دیکھ کوئی غریب الوطن بنامِ وطن — شہیدِ خنجرِ آفات مبتلائے محن
امیدِ چشمِ نوازش میں آکے بیٹھا ہے — سفر کی لاکھ صعوبت اٹھا کے بیٹھا ہے
انھیں تشفیِ دل کی نوید کس سے ملے — پیامِ راحتِ روزِ سعید کس سے ملے
خبر بھی ہے در و دیوارِ قید خانوں کے — جو ہیں امیں ترے بیتے ہوئے زمانوں کے
ترے عزائمِ ہستی کو یاد کرتے ہیں — شرابِ عشق کی مستی کو یاد کرتے ہیں
جو جد و جہد تھی آزادئ وطن کے لئے — دیا تھا خون جو شادابیِ چمن کے لئے
ہیں تیری موت کے سب آہ سوگواروں میں — کوئی نہیں جو نہ ہو تیرے بیقراروں میں
جماعتِ علماء کا ہجوم روتا ہے — ترے فراق میں دار العلوم روتا ہے
تری فراستِ کامل تری دیانتِ دیں — ترا خلوص، تری زندگی کا حسنِ یقین
وہ رنگ و نسل کی تفریق نو سے بیگانہ — تری حیاتِ عمل کا حسین افسانہ
وہ تیرا منفرد اندازِ خدمتِ انساں — کرے گا ناز سدا جس پہ میرا ہندوستاں
وہ تیرا لطف بھرا مہر، پیار کی باتیں — وہ دوستوں سے تری دلنشیں ملاقاتیں
وہ دشمنوں سے بھی برتاؤ دوستانہ ترا — قرونِ خیر سے ملتا ہوا زمانہ ترا

قسم خدا کی ہمیں جب بھی یاد آئے گا
قدم قدم نئی اک راہِ غم دکھائے گا

علامہ [illegible] صابری

آہ مولانا حفظ الرحمٰن

مولانا عامر عثمانی ایڈیٹر "تجلی"

کچھ لوگ مرتے ہیں تو ایک آنکھ بھی ان پر رونے والی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ مرتے ہیں تو احباب واقربا کا ایک محدود حلقہ ان پر آنسو بہالیتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ مرتے ہیں تو ادھر سے ادھر تک فضا میں اندوہ و ملال کا غبار بکھرتا چلا جاتا ہے اور کوئی نہیں گن سکتا کہ کتنی آنکھیں اشکوں سے نہا گئیں۔ صرف اشکوں ہی کی بات نہیں، ان کی موت پر روحیں تڑپ اٹھتی ہیں، دماغ لودے جاتے ہیں اور احساس کے ماتھے پر پگھلی ہوئی چنگاریاں پسینہ بن کر پھیل جاتی ہیں۔

کیا شک ہے کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن قدس اللہ سرّہ العزیز ایسی ہی بلند مرتبہ اور ذی شان ہستیوں میں سے تھے جن کی موت نے ہر اس شخص پر غم کا پہاڑ توڑ دیا ہے جسے مرحوم و مغفور کے اوصاف عالیہ اور محاسن و محامد کا ادراک ہے۔ جس کے سینے میں دل مر نہیں چکا ہے اور جو اپنے ملک و ملت کے مخصوص حالات ومسائل کا شعور رکھتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن طاب اللہ ثراہٗ کا وجود نامساعد حالات کی ماری ہوئی امت مسلمہ کے لیۓ آج کس قدر اہم تھا۔

کوئی بُرا مانے یا حیرت کرے ہم تو بلاخوف تردید عرض کریں گے کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کی موت کا حادثہ اگرچہ بہت بڑا تھا لیکن اثرات ونتائج کے اعتبار سے مجاہد ملت کی موت امتِ مسلمہ کے لیۓ زیادہ کاری زخم ہے مولانا آزاد رح اپنے اچھے اور بُرے ہلکے اور بھاری اعمال کا سرمایہ سنبھالے دوسری دنیا میں جا چکے ان کے لیۓ سوائے حسنِ ظن سوائے عقیدت، سوائے دعائے مغفرت کے ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ ان کے علم و فہم، ان کی ذکاوت وجودت، ان کی تحریر وتقریر، ان کی امتیازی آن بان سے صرفِ نظر تو بھلا کون کم سواد کرسکتا ہے لیکن یہ صداقت بہرحال اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے کہ ان کی رنگا رنگ، صلاحیتوں کا پورا شباب، ان کی ساری توانائیاں جنگِ آزادی کی نذر ہوئی تھیں اور جب آزادی کا سورج ہم پر طلوع ہوا تو وہ اپنی بیش بہا صلاحیتوں کا دامن سمیٹ کر اعزاز ومنصب کی ان بلندیوں پر جا بیٹھے تھے جو اگرچہ بجا طور پر فاتح سورماؤں کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن تاریخ کی چند منفرد اور خال خال مثالوں کے سوا وہاں تک عوام کے دل کی دھڑکنیں اور جمہور کے احساسات کی آہٹیں کبھی نہیں پہنچا کرتیں۔

لیکن مولانا حفظ الرحمٰن نور اللہ مرقدہ تو ان مجاہدوں میں تھے جنھوں نے عین میدانِ جنگ میں جان دی ہے یہ محض استعارہ نہیں ایک سامنے کی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد بھی تعصب، تنگ نظری، فرعونیت اور ظلم کی طاقتوں کے ہاتھوں ہمارا وطن امتِ مسلمہ کے لیۓ ایک جنگ گاہ، ایک کارزار بنا ہوا ہے جہاں مسلمان مسلسل مدافعت، فریاد واحتجاج اور کرب واضطراب کا مجسمہ بن کر رہ گئے ہیں اور ایک جارحانہ ذہن بے تکان ان پر جبر وجور کے ترکش خالی کر رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن علیہ الرحمۃ ظلم وطغیان کی ان طاقتوں سے نبرد آزمائی

کرنے والوں کی صفِ اول کے مجاہد تھے، وہ جسمانی اعتبار سے نحیف لیکن جرأت وہمت کے لحاظ سے بڑے شجاع تھے۔ شیردل تھے، جیالے اور نڈر تھے۔ ان کی زندگی کے تقریباً چالیس سال اس جنگ جُو سورما کی طرح گذرے ہیں جو اپنا کفن سر سے باندھے حریف کے آگے مستقل ڈٹا ہوا ہو۔ انھوں نے دوہری ابتلائیں جھیلی ہیں۔ چومکھی جنگ لڑی ہے۔ ایک طرف انھیں اپنی ہی ملت کے ان افراد سے دست و گریباں ہونا پڑا جو ان کی دانست میں غلط فکر ونظر کے علمبردار تھے۔ لیگی عقائد کے حامیوں سے وہ بڑی بے جگری کے ساتھ نبرد آزما رہے ہیں اور دوسری طرف امتِ مسلمہ کو باطل اور جارحانہ عزائم کے بے تحاشہ برسنے والے تیروں سے بچانے کی ان تھک جدوجہد انھوں نے اس وقت تک جاری رکھی جب تک تقدیرِ الٰہی نے انھیں بستر کا پیوند بن جانے پر مجبور نہیں کردیا۔ اللہ اللہ کیسے اَن تھک۔ بے باک، سیماب وش۔ سرگرم اور جفاکوش تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ایک شعلۂ جوالا۔ ایک موجِ رواں۔ ایک جہدِ مجسم۔ ایک نہ سرد ہونے والی لگن۔ ایک ایسا پیکرِ امید جس نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا اور مسلمانوں کو للکارا کہ نادانو! بھاگو مت، خوف زدہ مت ہو۔ یہ ملک تمہارا ہے، یہ زمین وآسمان تمہارے ہیں۔ متحد ہو کر ظلم کی طاقتوں کا مقابلہ کرو اور ثابت کردو کہ وطن کی محبت میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ہم اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتے کہ جمعیۃ العلماء کے سیاسی فکر سے ہمیں کامل اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ ہمارے پاس اختلاف کے متعدد دلائل تھے اور ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس اعتراف سے بھی ہمیں کوئی روک نہیں سکتا کہ مولانا حفظ الرحمٰن خداداد صلاحیتوں اور قابلِ رشک محاسن ومحامد کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ ان کے اخلاص اور دردمندی میں بھی دو رایوں کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی حیات قوم وملت کے لئے بڑی قیمتی تھی۔ وہ مضبوط سہارا تھے اور آج جبکہ وہ اپنے اعمال کا دامن سمیٹ کر اپنے رب سے جاملے ہیں تو ہمارے لئے ایک یاس انگیز ساعت ہے۔ ایک کرب ناک لمحہ ہے۔ ایک حادثۂ عظیم ہے۔ موت کا فرشتہ اگر اللہ جل شانہ کا تابع فرمان نہ ہوتا تو ہم فرطِ غم میں یہ کہنے سے بھی نہ چوکتے کہ مجاہدِ ملت کی روح قبض کرنے میں اس نے جلد بازی کی ہے۔
موصوف اگرچہ جواں سال نہیں تھے کہ ہم غالب کی زبان میں کہہ سکیں ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں تھے کہ دس بیس سال اور جیئے جانا عجوبہ کہلاتا۔
مگر ہمارے منہ میں خاک۔ کوئی بڑے سے بڑا حادثہ اور عظیم سے عظیم ابتلا بھی خالقِ حکیم ودانا کی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ ہر قیامت جو ہم پر ٹوٹتی ہے اس کا حق ہے کہ ٹوٹے کیونکہ جو کچھ جس وقت ہوتا وہ اسی لائق ہے کہ اسی وقت ہو تقدیرِ الٰہی میں جہاں انحراف نہیں وہیں خطا بھی نہیں۔ تعالی اللہ عزّوجلّ۔

حاصلِ تعزیت یہ ہے کہ جس وقت ہمیں شیردل اور مخلص مجاہدوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن جیسے سخت کوش، بلند حوصلہ اور انتھک بزرگ کا اٹھ جانا ایک ایسے ستون کا گر جانا ہے جو ملتِ مسلمہ کے عزم وہمت کی گرتی ہوئی دیواروں کا سہارا بنا ہوا تھا

جس نے ۱۹۴۷ء کی قیامتِ صغریٰ میں آگ اور خون کے سیلِ تند سے گذرتے ہوئے بے شمار انسانوں کو پیامِ حیات دیا تھا۔ اور اس کے بعد سے مسلسل اب تک وہ ہر محاذ پر اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ملک و ملت ہی کی خدمت اور عدل و صداقت ہی کے گیسو سنوارنے پر کھپا رہا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری قوم ایک طویل عرصہ سے مردہ پرست ہے! وہ زندوں کو بہت کم شمار میں لاتی ہے مگر جب وہ مرجاتے ہیں تو ان کی عقیدت و محبت کا پرچم ساتویں آسمان تک پہنچا دیتی ہے۔ آپ دیکھتے ہی ہیں کہ جب کوئی بزرگ دارِ فانی سے تشریف لے جاتے ہیں تو کتنے ہی دنوں تک ماتم سرائی کا وہ غلغلہ بلند رہتا ہے کہ گویا سینے پھٹ جائیں گے اور دل و جگر اشک بن کر بہہ جائیں گے۔ جا اور بے جا صحیح اور غلط ہر طرح کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ نظم و نثر کی ساری استعدادیں ختم کردی جاتی ہیں۔ لیکن مرنے والے کی زندگی میں ان قصیدہ سراؤں نے کس حد تک عقیدت و انقیاد کا ثبوت دیا اور عملاً اس کے کاز کو کتنی تقویت پہنچائی یہ سوال دردناک ہی دردناک ہے۔ خود مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی زندگی میں یہی ملال رہا کہ جس محاذ پر انھیں زبانی جمع خرچ کی نہیں عملی تعاون کی ضرورت تھی وہاں وسیع معنوں میں انھیں تعاون نہ مل سکا۔

جو لوگ مولانائے مرحوم کی محبت کے دعوے دار ہیں انھیں ماتم دشیون اور قصیدہ سرائی سے جلد فراغت حاصل کرلینی چاہیئے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ کا صدہا سالہ ماتم کسی مرض کا علاج نہیں بن سکا تو اور کسی کی طویل عزاداری کیا ثمرہ دے گی۔ محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ جس جہدِ مسلسل کو مرحوم نے اپنایا تھا آپ بھی اسی کو حرزِ جان بنایئے۔ آپ اگر نظریاتی پہلو سے ان سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں تو جد وجہد سرگرمی، تہوّر، تندہی اور ایثار و اخلاص میں تو بہرحال ان کی تقلید لازم ہے۔ اگر انیسؔ و دبیرؔ کی طرح مرثیے ہی پڑھنے ہیں تو سمجھ لیجئے مرحوم کی روح آپ کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل و رحمت سے نوازے اور ہمیں آپ کو خدمتِ ملک و ملت کی توفیق دے۔

مولانائے مرحوم کے پس ماندگان سے ہم تہ دل کے ساتھ اپنی غمگساری اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں نیز جمعیۃ العلماء کے اربابِ حل وعقد سے ملتمس ہیں کہ مایوس و دل گرفتہ نہ ہوجائیں۔ انسان مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جد وجہد کا میدان بہرحال جوں کا توں ہے۔ مایوسی اور باہمی جنگ کے اقتدار سے دامن بچاکر مولانائے مرحوم کے کاز کو تکمیل تک پہنچانا ہی چاہیئے اور اگر طبعِ نازک پر گراں نہ ہو تو یہ گذارش بھی ہم ادب کے ساتھ کریں گے کہ نظری اور عملی اعتبار سے بعض خامیاں جمعیۃ العلماء میں پائی جاتی ہیں ان پر بھی بے نفسی اور دیانت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیئے۔ خود تنقیدی ترقی کا زینہ ہے۔ اگر جمعیۃ کے اربابِ حل وعقد خلوص کی سطح پر آکر غور کریں گے تو انھیں پہلے ہی مرحلے میں اس کی ضرورت محسوس ہوگی کہ لگے بندھے خطوطِ عمل میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ یہ محض اشارہ ہے۔ تفصیل پر غور کرنا اربابِ جمعیۃ کا کام ہے۔

از جناب قمر عثمانی

وہ حاملِ طریقِ مسلماں گذر گیا
انسانیت کو غم ہے کہ انساں گذر گیا

دل بے قرار ہے تو نظر اشکبار ہے
تسکین قلب و روح کا ساماں گذر گیا

دنیائے علم و فن میں اندھیرا ہے چار سُو
وہ علم و فن کا مہرِ درخشاں گذر گیا

بے باک، وہ مجاہدِ ملّت نہیں رہا
وہ مردِ حق، وہ حق کا نگہباں گذر گیا

وہ بے بدل خطیب، وہ عالم، وہ نکتہ سنج
وہ آشنائے شورشِ دوراں گذر گیا

بطلِ جلیل و فخرِ وطن، رہ نمائے قوم
مہر و وفا کا نیّرِ تاباں گذر گیا

جس کی حیات ایک مسلسل جہاد تھی
وہ حق نگر وہ صاحبِ ایماں گذر گیا

ناساز گار وقت میں امیّد کا نشاں
وہ رونقِ حیات کا عنواں گذر گیا

منزل کچھ اور دُور ہوئی تیرگی بڑھی
وہ میرِ کارواں وہ حدی خواں گذر گیا

جس کا نفس نفس تھا حیات آفریں پیام
وہ آشنائے جادۂ عرفاں گذر گیا

وہ خوبیٔ صفات کا حامل وہ خوش مقام
وہ آشنائے عظمتِ انساں گذر گیا

اے جانے والے، روح تیری شاد کام ہو
حق مغفرت کرے ترا اونچا مقام ہو

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات

از
مولانا محمد سالم صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

۲ر اگست ۱۹۶۲ء کی صبح کو ریڈیو کی اس الم ناک اطلاع نے شام غم میں تبدیل کردیا کہ بیسویں صدی میں ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کے صاحبِ فراست، مردِ راہداں، مجاہدِ ملت، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ایم، پی و ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کل نفسٍ ذائقۃ الموت۔

خبر سننے کے بعد ذہن میں گذشتہ تیس سال کی ماضی سے یک دم حجابات اُٹھے اور فکر کو یہ تاثیر دے کر رخصت ہوگئے کہ آج صرف مجاہد ملت کی کتاب زندگی ہی بند نہیں ہوئی بلکہ! مولانا محمد علی جوہر کے انقلابی فکر کا امین........امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی دانشوری کا مثیل........ شفاء الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے عزم راسخ کی تصویر........ڈاکٹر انصاری مرحوم کے فکر وسیاست کا راز داں........ امیرِ شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی طلاقتِ لسانی کا نمونہ.. ......شیخ الاسلام حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری کے ذہنِ رسا کی تمثال........مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رح کے تدبر کی یادگار........ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رح کی نزاکتِ شعور کا حامل ....سحبان الہند مولانا احمد سعید کی دلکشیوں کا مرقع ....

اور ایوانِ حکومت میں جرأت ویقین کی بھرپور قوتوں کے ساتھ ملت کا حق شناس ترجمان آج سب کچھ لے کر رخصت ہوگیا۔ بالفاظِ دیگر بیسویں صدی کے میدانِ سیاست کی بنیاد، اور فعال شخصیتیں جو اپنی زندگی کے جوہری کرداروں کے ساتھ مجاہد ملت کے پیکر میں ۲ر اگست ۱۹۶۲ء سے پہلے تک زندہ تھیں آج وہ سب بیکدم موت کے آغوش میں آسودہ ہوگئی ہیں اور ارض وطن کی سیاسی کائنات میں جتنی صبحیں ہوچکی تھیں آج سب کی شام ہے والامر بید اللہ، و ھو علیٰ کل شی قدیر۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی زندگی کے طویل تر وقفہ میں ان کی مرکز افکار چوں کہ جمعیۃ علماء رہی ہے اس لیئے قدرتی طور پر ان کے بدل یا نعم البدل کا تجسس اسی جماعت کے بقاء یا ارتقاء کے لیئے اہم بنتا ہے۔

آج سے پہلے تک اکابر جماعت کے حوصلہ مندانہ فیصلوں کو جامۂ عمل پہنانے والوں نے اگرکسی منزل پر دائرۂ عمل میں ناواجب حدبندی اور محدودیت پسندی روا رکھی ہو جس کے طبعی اور منطقی نتیجے کے طور پر یگانوں میں بیگانگی کا شعور ابھرا ہو تو اکابر کا لحاظ عموماً اور مجاہد ملت کی عظمت شخصیت خصوصاً اس کے لیئے سامانِ تلافی بہم پہونچاتی رہی ہے لیکن مستقبل میں یہ رخ جمعیۃ العلماء کے ارباب بست وکشاد کی نگہ التفات کا بطور خاص ضرورت مند معلوم ہوتا ہے۔

مجاہد ملت کی وفات ایک اہم ترین حادثہ ہے اور کسی فرد واحد میں ان کی امتیازی صفات کے یکدم جمع نہ ہونے کے لحاظ سے اس نقصان عظیم کو ناقابل تلافی بھی کہا جا سکتا ہے لیکن تلافی کے امکانی خطوط شاید یہ ہو سکتے ہیں:-

اولاً یہ کہ آئینی طور پر اس ادارے کے اندرونی اور بیرونی نظام کو مستحکم بنایا جائے۔

دوسرے بے لاگ نظر و فکر کے ساتھ ان شخصیات کا جائزہ لیا جائے جنھوں نے آزادئ وطن کے بعد سے جماعت کے مقاصد کو اپنی قوتِ فکر و عمل کا مخلصانہ محور قرار دیا ہو اور صوبائی جمعیتوں کو ان کے سوشل ورک نے زیادہ سے زیادہ عوامی بنایا ہو۔ اور اسی کو رجالِ کار کے اصابت فکر قوت عمل اور وقت شناسی کا واحد معیار قرار دیا جائے، امید ہے کہ اس معیار پر جماعت کے مرکزی کردار میں ان کی شرکت خوش آئند مستقبل کی ضمانت بھی بن سکیگی اور قدر شناسی کا تقاضا بھی۔

تیسرے یہ کہ آزادئ وطن کے بعد مسلمانوں کے مسائل کا حل سوچنے کے لیے جس نئے اندازِ فکر کی ضرورت ہے اس باب میں مفکرین کے لیے ان اہل نظر کو مطمئن رکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو نزاکت وقت و ضرورت کا دانشمندانہ احساس بھی رکھتے ہیں اور حل طلب مسائل پر مدبرانہ نظر بھی۔

یہ طبقہ بالغ نظر تجربہ کار اور صاحب علم و بصیرت اکابر کی دعوت و قیادت پر تو لبیک کہہ سکتا ہے لیکن کسی کم مایہ و کم آمیز قیادت کے تسلیم کر لینے پر ان کی انفرادیت کا ضمیر خوش رہنے کے لیے تیار ہو جائے یہ ممکن نظر نہیں آتا۔

اس لیے اس مرحلہ پر اکابر جمعیۃ کو حفاظتی عظمتوں کی برقراری کے لیے ایک نئے امتحان سے دوچار ہونا ہے آزادئ وطن کے بعد جن مراحل سے جمعیۃ کو گذرنا پڑا ہے اس میں موجودہ مرحلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ خدا کرے کہ نزاکتِ وقت کی دشواریوں پر اربابِ بست و کشاد قابو پا سکیں۔

اخیر میں ہم حضرت مجاہد ملت کے اہلِ خاندان کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کر کے شرکتِ غم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل اور اجر جزیل مرحمت فرمائے۔ آمین۔

تاریخی شخصیت

از
حیات اللہ انصاری
ایڈیٹر قومی آواز لکھنؤ

مولانا حفظ الرحمٰن کے جنازے کے ساتھ جانے والوں کو شاید اس بات کا پوری طرح احساس نہ ہو کہ آج اس عظیم شخصیت کو پہنچانے دو سو سال کی تاریخ آئی ہے جس کے ساتھ گہری غور و فکر ہے۔ بھاری قربانیاں ہیں دور رس قومی حوصلے ہیں اور جان ہار حق پرستیاں ہیں، یہ وہ تاریخ ہے جو شاہ ولی اللہ کے زمانے سے چلتی ہے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے ہوتی بائیکاٹ کی تحریک اور مقدم ستیہ گرہوں سے گذرتی ہوئی تقسیم ہند کی اور دو قومیں کے نظریہ کی مخالفت کرتی ہوئی موجودہ دور تک آتی ہے اور آج قومی یک جہتی کی علمبردار ہے یہ جانے والا اس عظیم تاریخ کے صف اول کے سالاروں میں سے تھا۔ وہ تو جا رہا ہے۔ لیکن ایک دلنشین سبق روشن شال اور افق تک رہ نمائی کرنے والے نقش قوم پر چھوڑے جا رہا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی اس اصول کا پکا نمونہ تھی کہ "درکفِ جامِ شریعت درکف سندانِ عشق"۔ ایک طرف انہوں نے مہاتما گاندھی اور جواہر لال جی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں پورا حصہ لیا۔ ستیہ گرہ کی جیل گئے، سوشلسٹ طرز کے سماج کی داغ بیل ڈالی، ملکی ترقیات کے منصوبوں کی تعمیر میں حصہ لیا، الیکشن میں حصہ لیا، غیر مفید اور مضر سیاسی پارٹیوں کا کھل کر مقابلہ کیا، آزادی سے پہلے کانگرس کی خارجہ پالیسی کی تعمیر میں حصہ لیا۔ سیکولرازم کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں معقول لوگوں کا ہاتھ بٹایا، اور دوسری طرف انہوں نے مسلمانوں کے مدرسوں، خانقاہوں، قبرستانوں، مزاروں، مسجدوں کے بچانے اور بازیافتی کے لئے جدوجہد کی، دینی تعلیم کی تحریک کی داغ بیل ڈالی اس کے لیے ریڈرس تیار کرائیں اور پھر اس اسکیم کو چلانے کے لیے ہندوستان بھر میں گھومے پھرے، انھوں نے خود بھی کئی قابلِ غور دینی کتابیں لکھیں۔ سیرت کے موضوع پر ان کی تقریر بہت اعلیٰ ہوتی، دینی کتابوں کی نشر و اشاعت کے لیے مولانا نے ندوۃ المصنفین قائم کیا، اس طرح مولانا حفظ الرحمٰن پورے سیاسی لیڈر بھی تھے اور پکے باعمل عالم دینی بھی۔

ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد چلی وہ طرح طرح کے عنصروں سے مرکب تھی اس میں مذہبی قسم کی عقیدت بھی تھی، سیاسی سوجھ بوجھ بھی، جوانی سے بھرپور، جوش و خروش بھی، فلسفیانہ فکر بھی۔ تاریخی اور بین الاقوامی نظر بھی، تعمیری صلاحیتیں بھی۔ اور اس طرح کے اور بھی بہت سے عناصر۔ اگر یہ جدوجہد اتنے عناصر کا گلدستہ نہ ہوتی تو اس کی کامیابی ممکن نہ ہوتی، اس تحریک نے ایسے ایسے لیڈر پیدا کیے جنھوں نے اس جدوجہد کے بعض محاذوں کی سالاری کی ذمہ داری اٹھالی تھی اس بوجھ کے اٹھانے میں مسلمانوں نے بھی اپنے تناسب بھر حصہ لیا، ان کی صف سے جو عظیم لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے اس گلدستہ کا ایک عنصر بن کر میدان سنبھال لیا، ان میں سے ایک بہت بڑے سالار مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ اگر

آزادی کی تاریخ کا ان کی شخصیت کو بھلاکر مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سی کڑیاں چھوٹی ہوئی ملیں
گی اور ایسا محسوس ہوگا جیسے کسی نے ایک درخت کی تصویر سے ایک بڑی ہی شاخ نکال دی ہے جس
کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس کے پتے اور پھل کس چیز سے اٹکے ہوئے ہیں۔

مسلم لیگ نے "مذہب خطرے میں ہے" کے نعرے کی بناء پر دو نیشن کا نظریہ چلایا تھا، اس وقت
اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس نظریئے نے سیاسی زندگی ہی کو نہیں قومی اور انفرادی زندگی کو بھی کیا شکل دیدی
تھی، لیکن مسلمانوں نے غیر ملکی مسلمانوں کے خلاف مشورے دیئے تھے، ان کا سماجی بائیکاٹ کیا تھا ان
پر چھرے چلائے تھے، ان کو ذلیل کیا تھا اور گندگیاں اُچھالی تھیں اور یہ فضا برپا کردی تھی، کہ جو مسلمان
لیگی نہیں ہے وہ غدّار ہے، اس فضا کا سامنا کرنا، اپنی عزت، نیک نامی، سیاسی کردار اور جان کو
خطرے میں ڈالنا آسان نہیں تھا۔

یہ حالات دیکھ کر بہت سے قوم پرور گوشہ نشین ہو گئے تھے، لیکن اس زمانے میں بھی مسلمانوں
کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے خطروں کو گوشہ نشینی پر ترجیح دی، اور لیگ کی غلط تحریک کا، سر
ہتھیلی پر لے کر مقابلہ کیا، اس جماعت میں ایک گروہ علمائے دین کا بھی تھا۔ ان کے چند چوٹی کے سالاروں
میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن تھے وہ کبھی جھجکے نہ گھبرائے ان کا سیاسی شعور، ان کا نکتہ داں اسلوب
اور ان کی آتش بیان تقریر یہ چیزیں تھیں جنھوں نے لیگ کی آہنی صفوں میں رخنے ڈال دیئے اور
جگہ جگہ الیکشن میں ان کے نمائندوں کو شکست دے دی۔

مولانا حفظ الرحمٰن مسلم لیگ کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھے اور ان پر اس تحریک کا دوسری
طرح کا ردّعمل ہوا۔ اور فسادوں کی لہر چلی تو انھوں نے کہا کہ آج سے میرے لیئے لیگی اور غیر لیگی دونوں
یکساں ہیں اور پھر وہ اس اصول پر قائم رہے۔

جب دہلی میں فساد نے قدرتی سیلاب کی شکل اختیار کرلی ہے جس میں سوائے گنتی کے چند لیڈروں کے سب
کے پاؤں اکھڑنے لگے اس زمانہ میں مولانا حفظ الرحمٰن شہر میں گھومے گھومے پھرتے تھے اور جو بھی ممکن تھا
وہ کرتے تھے لیکن حالات بے حد خراب تھے خود ان کا وجود اور ان کا گھرانا خطرے میں تھا ایسے وقت میں مولانا
کے بعض قریبی غیر مسلم دوستوں نے مشورہ دیا کہ اب اپنے کو خطرے میں نہ ڈالیئے، آپ یا تو پاکستان
چلے جائیں یا کسی اور جگہ باقی مسلمانوں کی حفاظت کے لیئے جو کچھ ہم سے ہوسکتا ہے وہ ہم کریں گے۔ مولانا
نے اس پر جواب دیا کہ جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچا لے جاؤں گا وہ کس مصیبت کی ہوگی، آپ
کیا باتیں کرتے ہیں یہ موقعہ جان دینے کا ہے یا جان بچانے کا۔

اس زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن اکیلے ذریعۂ اطلاع تھے مہاتما گاندھی کے لیئے۔ یہ روزانہ وہاں جاتے
تھے اور بتلاتے تھے کہ شہر میں کیا ہورہا ہے۔ گاندھی جی سرکاری اطلاعوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ وہ
صرف مولانا کی اطلاعوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ یعنی ان ہی کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان ہی کے کانوں
سے سنتے تھے۔ اور اسی دیکھنے اور سننے کا نتیجہ تھا کہ گاندھی جی نے دہلی والا مرن برت رکھا۔

جب گاندھی جی نے مسلمانوں کے لیئے دہلی میں مرن برت رکھا تو انہوں نے مولانا حفظ الرحمٰن سے کہا کہ

مولانا صاحب جب آپ روزانہ آکر مجھے مسلمانوں کا حال بتاتے تھے تو میں دل میں شرمندہ ہوتا تھا کہ میں کچھ کر نہیں پا رہا ہوں۔ اور میں آپ سے آنکھیں چار نہیں کر پاتا ہوں۔ لیکن آج میں شرمندہ نہیں ہوں کیونکہ جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ کر چکا۔ اب معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

اس زمانہ میں جو لوگ گاندھی جی سے قریب تھے وہ کہتے کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی اس زمانہ میں جو لوگ سب سے زیادہ نمائندگی کرتے تھے وہ تھے مولانا آزاد۔ مولانا حفظ الرحمٰن۔ ان دونوں میں سے مولانا حفظ الرحمٰن کی پوزیشن میدان جنگ کے سالار کی تھی۔ جو ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

۱۹۴۷ء آزادی لے آیا۔ لیکن آزادی کے ساتھ بہت سے مسائل بھی آئے۔ اُن میں سے بعض مسائل ایسے تھے جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے تھا۔ سوال یہ تھا کہ ان کو کون حل کرے۔ ہندو فرقہ واریت لیگ کے ردِّ عمل میں بہت زور پکڑ چکی تھی اور اس نے قوم پروروں کے کاموں میں بھی بہت سی نظریاتی الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ یہاں تک کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے معاملوں میں پڑنا بھی فرقہ واریت ہے۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن نے ان تنگ نظریوں کا خیال کیا۔ اور نہ اس بات کا کہ کس طرح ان کی سیاسی پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ بے خطر میدان میں اُتر آئے۔

عام مسلمانوں کا کیا حال تھا اس زمانے میں؟ انہوں نے دو نیشن کے نظریئے کو اسلام کا اہم جزو سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ اور یہ نعرہ لگایا تھا کہ مسلمان چونکہ ایک الگ قوم ہے اس لیئے ان کو الگ وطن چاہیئے اس لیئے ہندوستان کی تقسیم کر دو۔ لیکن جب تقسیم ہو گئی اور لیگ جیت گئی، تو یہ جیت ہی اس کی سب سے بڑی ہار ثابت ہوئی۔ پاکستان میں مسٹر جناح نے جو دو نیشن کے نظریئے کے حامی تھے یہ کہہ کر اس نظریئے کو ختم کر دیا۔ پاکستان کے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور ہندوستان میں یہ نظریہ یوں ختم ہو گیا کہ خود یہاں کے مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ یہ بات محال ہے کہ ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان پاکستان چلے جائیں۔ یا وطن تو سمجھیں پاکستان کو اور رہیں ہندوستان میں۔ ایسی صورت میں ہندوستان کے مسلمان کیا کریں۔

دو نیشن کا نظریہ ایک ایسی چیز تھی جس کو لیگی مسلمانوں نے ایک حق سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ اب وہ مضحکہ بن گیا۔ اس چیز نے ان کے اعتماد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور وہ سخت پستی اور ذلت کا احساس کرنے لگے۔ اس موقع پر مولانا حفظ الرحمٰن نے ان کا اعتماد بحال کرنے کے لیئے ہندوستان کا دورہ کیا۔ کانفرنسیں کرائیں عام جلسے کرائے۔ اور ہر نازک موقع پر پہونچ گئے اور اس کا سلسلہ انھوں نے اپنی بیماری کے وقت تک جاری رکھا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات نے پنجاب کے مسلمانوں کے لیئے عجیب و غریب حالات پیدا کر دیئے تھے، یہ صرف مولانا حفظ الرحمٰن کی کوشش تھی کہ ان میں پھر یہ یقین پیدا ہو گیا کہ یہ بات ممکن ہے کہ ہندوستان میں اچھے مسلمان بن کر آزادی سے رہو۔ اور غیر مسلموں ہی کی طرح جمہوریت سے فائدہ اٹھاؤ۔

مولانا نے ہمیشہ بہادری اور جرأت سے حکومت پر تنقید کی۔ اس تنقید نے جہاں حکومت کو اس کی غلطیوں کی طرف متوجہ کیا، وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوستان کی جمہوریت سچی جمہوریت ہے جہاں حکومت پر ہر قسم کی تنقید کی جا سکتی ہے اور جہاں غیر مسلموں کو بھی دادرسی میں اپنا ساتھی بنایا جا سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کے بڑے کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کو جو آزادی کے

زمانہ میں ایک اجتماعی اور جارحانہ جماعت تھی، تعمیری اور قیمتی جماعت بنا دیا جو لوگ عوامی زندگی سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف یہی ایک ایسی جماعت ہے جو اس انقلابی تبدیلی کو سہہ کر زندہ رہ گئی اور آج دوسری قسم کے خاموشی سے چلنے والے اور برسوں میں سرسبز ہونے والے پروگراموں میں لگی ہوئی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کو عام طور سے ایسا لیڈر سمجھا جاتا ہے جو مسلمانوں ہی کے معاملات سے دلچسپی لیتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ قومی رہتا تھا۔ لیکن یہ خیال اس حد تک صحیح نہیں ہے جہاں تک سمجھا جاتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے بہت سے قومی مسائل کے حل کرنے میں حصہ لیا اور ملک کے بہت سے غیر مسلم لیڈروں کی نظروں میں ان کا درجہ قومی لیڈر کا تھا۔ ان کے سامنے شرنارتھی اور مختلف ریاستوں کے ہندو سکھ اور عیسائی بھی اپنے مسئلوں کو لے کر آتے تھے۔ مولانا کو ایسے معاملوں میں بھی پورا درک حاصل تھا۔ وہ ان کو بھی سمجھ لیتے تھے اور حل کر لیتے تھے۔ اس طرح کانگریسیوں اور غیر کانگریسیوں کے ایک بہت بڑے طبقے کے نزدیک تقسیم کے بعد والے غلط نظریئے کے مطابق اب وہ فرقہ پرور قطعی نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد۔ رفیع صاحب اور جواہر لال جی کی طرح قومی لیڈر کی سی تھی۔ اگر مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی اور وفا کرتی تو چند برسوں میں سارا ہندوستان ان کو اسی نظر سے دیکھنے لگتا۔ کیونکہ لوگ یہ تو محسوس کرنے ہی لگے تھے کہ مولانا اس ملک کی گاڑی کا چوتھا پہیا ہیں جس کے بغیر گاڑی اگر چلے گی تو بہت سے خطروں کا سامنا ہوگا۔

مولانا کا ذاتی کردار لیڈر کا نہیں تھا بلکہ بوریہ نشین درویش کا تھا۔ جس کے دروازے پر کوئی دربان نہیں ہوتا ہے وہاں ہر شخص آسکتا تھا اور ہر وقت آسکتا تھا صرف آہی نہیں سکتا تھا بلکہ قیام بھی کر سکتا تھا۔ اور مولانا سے اپنے گھریلو اور بے حد نجی معاملوں سے لے کر سیاسی معاملوں تک میں مدد کی درخواست کر سکتا تھا حد یہ ہے کہ جو لوگ مولانا کی ہر وقت مخالفت کرتے رہتے تھے وہ بھی مدد کی درخواست لے کر آتے تھے اور مدد حاصل بھی کر لیتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی آخری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ایک انگریزی روزنامے کو بڑے پیمانے پر قائم کیا جاتے جو نیشنل طرز فکر پر اس طرح چلے کہ مسلمانوں کے معاملوں پر خاص توجہ رہے اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو اس پہاڑ کو بھی وہ اٹھا لیتے لیکن اب ان کے بعد ان تمام لوگوں کا جو چاہے مسلم ہوں چاہے غیر مسلم یہ فرض ہے کہ مولانا کی اس تمنا کو جیتی جاگتی شکل دے دیں اور یہ سمجھ کر یہ شکل دیں کہ مولانا کی زندگی کے پیام اور ان کی جدوجہد کو حیاتِ تازہ اسی طرح مل سکتی ہے۔

ہم مولانا حفظ الرحمٰن کی اہلیہ محترمہ، بچوں اور عزیزوں کے غم میں پوری طرح شریک ہیں اور ان کو یقین دلاتے ہیں کہ مولانا کی شخصیت ان کے خاندانی حدود سے منزلوں آگے جا چکی ہے۔ آج ہزاروں ایسے افراد موجود ہیں جن کو مولانا کے اٹھ جانے کا اتنا ہی غم ہے جتنا کہ ان کی حقیقی اولاد کو واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر یہ مقولہ بالکل صحیح ہے۔ "موت العالِم موت العالَم"

از

رنبیر سنگھ ایڈیٹر "ملاپ" دہلی

اگر کہوں کہ محترم مولانا حفظ الرحمٰن کے دیہانت کی خبر سنتے ہی میرا دل رو اٹھا تو من کی بھاؤنا بیان نہیں ہوتی
رونا معمولی سی بات ہے کبھی کبھی اس سے من کو سکون بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ سوچتے ہی کہ مولانا حفظ الرحمٰن اب
اس دنیا میں نہیں، دل سے ایک ہوک اُٹھتی ہے۔ ایک چیخ جس میں سکون نہیں۔ شانتی نہیں۔

آج سے چند برس پہلے میں انھیں ذاتی طور پر جانتا نہیں تھا۔ تب جانا تو ایسا محسوس ہوتا کہ اس آدمی کے
سینے میں نہ صرف اپنے دیش کے لیے عظیم محبت ہے۔ سچی وطن پرستی کے اصولوں کے لیے ایک لاپناہ جذبۂ عقیدت
بلکہ ایسی انسانیت بھی جو ہر نزدیک آنے والے کو پیار کی زنجیر میں باندھ لیتی ہے۔ ایک بار جو ان کے نزدیک آجائے
اس کے لیے پھر دور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف اس جمعیۃ العلمائے ہند، کے پردھان تھے
جس نے سخت ترین آزمائش کے دنوں میں بھی دو قوموں کی تھیوری کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ بلکہ ملک
کے ایسے رہنما بھی جن کے تدبّر پر، جن کی قابلیت پر اور جن کی دوست پروری پر اس ملک کا ہر وطن پرست
ناز کرتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ کئی لوگ جو اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھ نہیں پاتے، وہ جمعیۃ العلمائے ہند پر کئی طرح کے
غلط اعتراض بھی کرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود اصلیت یہ ہے کہ مسلم ودوانوں کی اس جماعت نے اس وقت بھی ہندوستانی
مسلمانوں کو وطن پرستی کے راستہ پر چلانے کی کوشش کی جب فرقہ وارانہ نفرت وحقارت کی آگ
شعلہ زن ہو رہی تھی اور جب انگریز کے ایجنٹ کہیں "ہندو دھرم" اور کہیں "اسلام" کا نام لے کر عوام
کو گمراہ کر رہے تھے۔ میں نہیں کہتا کہ جمعیۃ العلماء کو اس معاملہ میں کوئی بہت بڑی سپھلتا ملی، اگر ملتی تو یہ
ملک تقسیم نہ ہوتا۔ مذہب کے نام پر حیوانیت نہ جاگتی۔ لاکھوں بے گناہوں کا خون نہ ہوتا۔ قریباً ڈیڑھ کروڑ
آدمی گھر سے بے گھر نہ ہوتے۔ یقیناً اس بہادر جماعت کو سپھلتا نہیں ملی، لیکن جس جرأت اور جوانمردی
کے ساتھ اس کے نیتا اور ورکر ملک دشمن طاقتوں سے لڑے ان کے پے درپے حملوں کے باوجود اپنے
عزم صمیم پر چٹان کی طرح قائم رہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن ان نیتاؤں میں سے نہ صرف ایک تھے بلکہ سب سے قابلِ احترام بھی۔ فرقہ پرستی کے
علمبرداروں نے اور نفرت وحقارت کے پرستاروں نے انھیں گالیاں دیں، انہیں طعنے دیئے اُن پر جسمانی حملے
بھی کیے۔ لیکن کسی کی چنتا کیے بغیر یہ بہادر مہا پرش وطن پرستی کے راستہ پر آگے اور آگے ہی بڑھتے چلے
گئے۔ آج جب وہ نہیں ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کی وہ پیار بھری آنکھیں ایک عجیب
دلبرانہ انداز میں مسکراتی ہوئی دیکھتی ہیں اور ان کی پیار بھری آواز کہتی ہے "وطن پرستی کی اس شمع کو بجھنے نہ دینا

اس کے لیئے کوئی بھی قربانی بڑی نہیں ۔"
اور اصلیت یہ ہے کہ وہ واقعی اس شمع پر قربان ہوئے۔ پچھلے عام چناؤ سے کافی دیر پہلے کچھ گمراہ شدہ گمراہ کن لوگوں نے فرقہ پرستی کی آگ کو از سرِ نو بھڑکانے کی کوشش کی تو وہ دیش میں جگہ جگہ پہونچے تاکہ اس نئے فتنے کا مقابلہ کرسکیں، لگاتار سفر، لگاتار تقریریں کرنے سے وہ بیمار ہوگئے۔ اتنے بیمار ہوئے کہ عام چناؤ کے دوران اپنے حلقہ میں بھی جا نہیں سکے۔ عوام نے ان کو کامیاب بنایا تو اس لیئے نہیں کہ مولانا ان کے پاس ووٹ مانگنے گئے تھے بلکہ اس لیئے کہ ان کے دل میں مولانا کے لیئے پیار تھا۔ عزت تھی۔ چناؤ کے بعد وہ صحت یاب نہیں ہوئے بیماری کی حالت میں ہی کام کرتے رہے۔ لیکن انھیں بیماری تھی ایسی جس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کے گلے کے نچلے حصہ میں کینسر تھا۔ اس کے علاج کے لیئے وہ امریکہ گئے۔ لیکن امریکہ میں بھی اس بیماری کا علاج تو ہے نہیں۔ وہ واپس آئے تو زیادہ کمزور اور نحیف ہوکر۔
اور آخر...... جانا سب کو ہے۔ دکھ ہوتا ہے اس وقت جب کوئی مہا پرش چلا جاتا ہے۔ ایسا آدمی چلا جاتا ہے جو اپنے لیئے نہیں، ملک کے لیئے زندہ تھا۔ تب دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے۔ ایک ٹیس جاگتی ہے لیکن ایسی حالت میں بھی راستہ تو صرف ایک ہے کہ ہم اس مہا پرش کے پیغام کو اور اس کے مشن کو یاد رکھیں

"مجاہد ملت رح سے آخری ملاقات" (بقیہ صفحہ ۸۵)

جس کی ساری زندگی صبح شباب سے لے کر شام پیری تک جد و جہد کی زندگی تھی۔ جس نے دشمنوں کی دشمنی اور اپنوں کی طعنہ زنی کی پرواہ کیئے بغیر اپنے مشن کو جاری رکھا۔
مولانا اس دنیا میں نہیں ہیں مگر جہد مسلسل، سرگرمی، تہور، تندہی اور ایثار و اخلاص کا ایک درس امت کے لیئے چھوڑ گئے ہیں اور ہم ان ہی چیزوں کو رہ نما بنا کر مولانا کی روح کو سکون دے سکتے ہیں۔

شرب دیوبند۔ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ء

مجاہد ملت سے آخری ملاقات

مولوی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی متعلم الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ منورہ)
اچھے انشا پرداز اور ابھرتے ہوئے مضمون نگاروں میں امتیازی حیثیت
کے مالک ہیں۔ زیر نظر مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر شگفتہ انداز
تحریر کا اچھا نمونہ ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے پسند کریں گے
(ادارہ)

الجامعۃ الاسلامیہ (اسلامک یونیورسٹی) مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیۓ ہمارے داخلہ اور روانگی
کی تیاری مکمل ہوچکی تھی۔ جہاں عالم اسلام کی اس نومولود عظیم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملنے کی
خوشی تھی وہاں اس سفر کے دوران مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملاقات کی توقع اس خوشی میں اضافہ
کررہی تھی۔

بمبئی کے اسکاؤٹ ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ مولانا مرحوم ٹاٹا میموریل ہاسپٹل میں زیر علاج تھے۔ ہوٹل
سے مولانا کو فون کیا گیا۔ ڈاکٹر نے ملنے کی اجازت نہ دی۔ مگر مولانا نے جب سنا کہ میں ایک عرصہ دراز کے
لیۓ ہندوستان سے باہر جارہا ہوں تو ڈاکٹر کی ممانعت کے باوجود ملاقات منظور فرمالی۔

جد امجد مفتی عزیز الرحمٰن رح صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہونے کے سبب مولانا کو ہمیشہ خصوصی تعلق
رہا۔ ہر مرحلۂ حیات میں اس خصوصی تعلق کا اظہار مولانا کی طرف سے ہوتا رہا۔ دارالعلوم دیوبند سے
فراغت کے بعد اور اکابر کے علاوہ مولانا کی کوششوں سے ہی مجھے دارالعلوم میں خدمت تدریس سپرد
کی گئی اور اس طرح کے نہ جانے کتنے واقعات خود میری زندگی سے وابستہ ہیں جو یاد آکر مولانا کے غم
کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔

ہسپتال کے کمرے میں مولانا مسہری پر آرام فرما تھے۔ لبوں پر وہی جاودانی تبسم، کھلی ہوئی پیشانی اسی
عزم ویقین کی غماز، میں نے مصافحہ کے لیۓ ہاتھ بڑھایا مگر مصافحہ کے بجائے مولانا نے گلے سے لگالیا۔

آہ یہ اس شفیق سینہ کا آخری لمس تھا جس میں دھڑکتا ہوا دل ایک میرے لیۓ ہی نہیں ہزاروں نوجوانوں
کے مستقبل کا سہارا بنتا تھا۔ یہ ملاقات تقریبًا ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ ہر مرتبہ میرے اٹھنے کے ارادہ پر
مولانا نے ہاتھ کی جنبش سے منع فرمادیا۔

مولانا کے ان الفاظ پر۔ "میں اب چند دنوں کا مہمان ہوں، امت کا بار اب تم نوجوانوں کے کاندھوں
پر ہے" آنسو بھر آئے۔ اس مرد مجاہد کے الفاظ میں پہلی بار مایوسی کی جھلک محسوس ہوئی (باقی صفحہ ۸۴ پر)

فخرِ ملّت رہبرِ ہندوستاں رخصت ہُوا

از جناب کامل قریشی دہلوی

اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ زباں رخصت ہوا
نکتہ رس، نکتہ شناس و نکتہ داں رخصت ہوا
صاحبِ دیں، صاحبِ لفظ و بیاں رخصت ہوا
مردِ عقل و ہوش، مردِ عزّ و شاں رخصت ہوا
ہم نوا، ہمدرد، ہمدم، ہم زباں رخصت ہوا
فخرِ ملت، رہبرِ ہندوستاں رخصت ہوا

فکر و فن، فہم فراست، زہد و تقویٰ لُٹ گئے
فلسفہ، منطق، سیاست، علم و انشا لُٹ گئے
غنچہ و گل، برگ و سبزہ، شاخ و لالہ لُٹ گئے
میکدہ، ساقی، صراحی، جام و صہبا لُٹ گئے
مے کشو روؤ کہ اب پیرِ مغاں رخصت ہوا
فخرِ ملت، رہبرِ ہندوستاں رخصت ہوا

روشنی کو، نُور کو، تنویر کو نیند آ گئی
ہمتوں کو، جہد کو، تدبیر کو نیند آ گئی
لفظ و معنی، خامہ و تحریر کو نیند آ گئی
نطق کو، گویائی کو، تقریر کو نیند آ گئی
اک خطیبِ ہند، اک جادو بیاں رخصت ہوا
فخرِ ملت، رہبرِ ہندوستاں رخصت ہوا

فرقہ بندوں، مفسدوں کے ذہن پر چھائے گا کون؟
غمزدوں، مجبوروں، مظلوموں کو اپنائے گا کون؟
مُردہ روحوں میں حیاتِ نو بہ نو لائے گا کون؟
اب ہمیں تاریکیوں میں راہ دکھلائے گا کون؟
قوم کا دل، ملک کی روحِ رواں رخصت ہوا
فخرِ ملّت، رہبرِ ہندوستاں رخصت ہوا

زندگی ویراں، پریشاں حال، مستقبل اُداس
ذہن افسردہ، نظر مایوس و غمگیں، دل اُداس
شمع گُل، پروانے مردہ، ظلمتیں، محفل اُداس
راستے سنسان، رہرو غمزدہ، منزل اُداس
کارواں والو! امیرِ کارواں رخصت ہوا
فخرِ ملت، رہبرِ ہندوستاں رخصت ہوا

مَردِ غازی، مردِ میداں، حفظِ رحماں الوداع
مُردِ حق، مُردِ مسلماں، مَردِ ایماں الوداع
پاک طینت، پاک سیرت، نیک انساں الوداع
الوداع اے جنتی، محبوبِ رضواں الوداع
تیری رخصت سے ہمارا ترجماں رخصت ہوا
فخرِ ملت، رہبرِ ہندوستاں رخصت ہوا

حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ

صاحبزادہ ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

ذیل میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مضمون پیش کیا جارہا ہے۔ یہ اب سے پندرہ برس پہلے یعنی تقسیمِ ملک کے فوراً بعد لکھا گیا تھا اس لئے اس میں صرف تقسیم ملک تک کے واقعات پر ہلکے ہلکے سے اشارے آسکے ہیں۔ ضروری تھا کہ گذشتہ پندرہ برس میں مولانا مرحوم نے اپنی جرأت و شجاعت خلوص و پامردی، قائدانہ اور مفکرانہ صلاحیتوں کے جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ان کا بھی کچھ ذکر کیا جاتا اور ظاہر ہے کہ گذشتہ پندرہ برس میں مولانا کی خدمات کا جو انداز رہا ہے وہ ایک مضمون میں کیا ایک کتاب میں بھی شاید ہی بیان ہو سکے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے حادثۂ رحلت نے جہاں ساری ملت کو سوگوار و اشکبار بنا رکھا ہے وہاں احقر بھی ان کی بزرگانہ سرپرستی سے محرومی پر اب تک درد بدل نالاں اور دست بدل حیران ہے بہت چاہتا ہوں کہ دلجمعی کے ساتھ مولانا کے متعلق اپنے تاثرات کو قلمبند کرلوں مگر دل کی پیہم دھڑکن جگر کی تپش، اشکوں کا سیلِ رواں اور غم و اندوہ کی کثرت سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ نظروں کے سامنے ایک اندھیرا ایک تاریکی ایک اضطراب اور ایک پردۂ غم چھا جاتا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور جو کچھ ہوا اسے حضرت مولانا کے لاکھوں سوگوار کس طرح برداشت کریں گے۔

عزیزی مشہود اقبال سلمہ اللہ تعالیٰ کا تقاضا ہے کہ ان کے رسالہ "مشرب" کے "مجاہد ملت نمبر" کے لئے میں کچھ لکھوں اور خود میرے تعلق اور جذبۂ محبت کا یہ فرض ہے کہ مولانا کی قومی اور ملی خدمات کا ایک تذکرہ اور ان کی سیرت و کردار کا ایک خاکہ اپنے دوستوں تک پہونچاؤں مگر سردست کوئی طویل مضمون حضرت مولانا کے متعلق مجھ سے بن نہیں پڑسکتا۔ مشہود اقبال کی فرمائش اور اپنے دلی تقاضوں کی تکمیل شاید اس مضمون سے کچھ ہوسکے۔

مولانا حفظ الرحمٰن رح ایک مشہور سیاسی لیڈر، مذہبی عالم، بلند پایہ مصنف، پرجوش مگر سمجھدار مقرر کی حیثیت سے عام طور پر روشناس ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسے حضرات ملک اور قوم میں اور بھی بہت سے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی عظمت میرے قلب میں ان کی سچائی، اخلاص، انتھک محنت، بلندیٔ فطرت، سادگی، سادہ مزاجی اپنی قوم اور ملک سے ان کی بے لوث محبت اور اس راہ میں ان کی قابل قدر ایثار و قربانی کی وجہ سے ہے۔ مولانا کے اختلاف میں اخلاص کی سچائی ہوتی ہے خفگی میں محبت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ خاموشی میں ہزاروں تقریریں چلتی ہوتی ہیں اور تقریروں میں خاموشیاں کروٹیں بدلتی رہتی ہیں۔ وہ عام مجامع اور سیاسی میٹنگوں میں بے تکان بولتے ہیں، اتنا بولتے ہیں کہ دوسرے بولنے والوں کا حق بھی

چھین لے جاتے ہیں مگر ذاتی معاملات پر ان کی زبان پر مہر سکوت لگ گئی ہے۔ کبھی اپنی انفرادی زندگی پر کسی دوست احباب سے کچھ نہیں کہتے اور کبھی کسی دوسرے آدمی سے تفریح اور تفنن کے لیئے لمبی بات نہیں کرتے۔ سادہ مزاج اور سادہ دل انسان، غصہ آئے تو کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے۔ خفا ہو تو گھنٹوں سنبھالے نہ سنبھلے، جو بات ہو منہ پر برملا کہے، چھوٹوں پر شفیق مگر شفقت کا انداز ایسا باریک کہ عام نظریں اسے پہچان بھی نہ سکیں۔ دل کو مدت سے اس کی حسرت تھی کہ مولانا کبھی ملیں تو گھل مل کر باتیں کریں۔ کچھ دیر اپنی کہیں ہماری سنیں، مستقبل کے لیئے کچھ مشورے دیں اور زندگی کو کارآمد بنانے کے لیئے کچھ نصیحتیں بھی ہوں، مگر انھیں نہ پہلے کبھی اس کی فرصت تھی اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس بے تعلقی پر ہزار تعلق قربان اور ان کی اس بیگانگی پر ہزاروں یگانگتیں فدا۔ بظاہر یہ بے تعلق اور ہر موقع ہماری حمایت و امداد کے لیئے سب سے پیش پیش۔ اپنے بڑوں کے سامنے ہمیشہ مؤدب، اور ان کی واجبی عزت و احترام میں بلا کے مستقبل۔ مگر سیاسی رائے کا اختلاف، اپنے بڑوں کے سامنے بھی پوری جرأت و ہمت سے کرنے کے عادی،

یہ مضمون نہ ان کی سوانح عمری ہے اور نہ ان کی زندگی کے کسی ایک رخ پر روشنی ڈالنے کے لیئے یہ مختصر سی تحریر کفایت کر سکتی ہے۔ ان کی زندگی اور سیرت کے کچھ دھندلے دھندلے سے نقوش ذہن میں ہیں۔ انہی کو پیش کرتا ہوں۔ کوئی بات کہیں کی ہے اور کوئی بات کہیں کی ظاہر ہے کہ ان متفرق ٹکڑوں سے ان کی زندگی کا کوئی خاکہ سامنے نہیں آسکتا مگر کچھ بھی نہ ہونے سے یہ اتنا سا ہی غنیمت ہے۔

میں اپنی عمر کے چھٹے ساتویں سال سے انھیں جانتا ہوں یہ ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۹ء کی بات ہے جب وہ ایشیا کی مرکزی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مدرس اور دارالعلوم کے اس وقت کے نظام کار کے ایک باغی رکن تھے۔ اصلاح دارالعلوم کے لیئے اس وقت جو تحریک پر زور اور پُر شور طریقہ پر چل رہی تھی اور جس کے سربراہ خود اس احقر کے والد حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ رحمہ اللہ تھے۔ یہ تحریک مولانا حفظ الرحمٰن کی آتشیں تقریروں سے پروان چڑھی تھی۔ دیوبند کی بڑی بڑی مساجد میں اس زمانہ میں ان کی بیسیوں تقریریں سنیں۔ دارالعلوم میں طلبا کی اسٹرائک، الانصار اور مہاجر مرحوم ان اخبارات کی نوک جھونک۔ لجنۃ الاتحاد کے سرگرم جلسے۔ پرجوش طلبہ کی بغاوت، مادر علمی کی اصلاح کیلئے ہمہ گیر تحریکات۔ اس زمانہ کے ان سب ہنگاموں میں مولانا حفظ الرحمٰن شریک رہے۔

اسی زمانہ کا یہ ایک واقعہ ذہن میں تازہ ہے کہ مولوی محمد مظہر الدین مرحوم مالک اخبار "الامان" دہلی سے دیوبند آئے دارالعلوم کے ادارۂ اہتمام کی حمایت میں جامع مسجد میں ان کی تقریر ہوئی اور مولانا حفظ الرحمٰن نے وہیں انھیں دوبدو جواب دیا اور ان کی شعلہ بار تقریر سے مجمع کا رنگ بگڑ گیا۔

دیوبند کے بعد یہ جامعہ ڈابھیل میں پروفیسر کی حیثیت سے کئی سال رہے۔ میں بھی اپنے والد مرحوم کے ساتھ پڑھنے کے بہانے سے اس درسگاہ میں گیا اور رہا۔ دو سال مولانا کے کمرہ کے بالکل قریب رہنے کا اتفاق ہوا۔ چار پانچ سال کا یہ عرصہ جو ڈابھیل میں بسر ہوا مولانا کی زندگی کا عجیب زمانہ تھا بظاہر سکون کہ مشاغل صرف تعلیم و تدریس تصنیف و تالیف کے علاوہ اپنے استاذ مرحوم (حضرت علامہ کاشمیری مرحوم) سے علمی افاضہ و استفادہ تھے مگر بباطن بے بہرہ، بے سود۔ وہی سیاسی مذاق کی گہرائیاں، ملک کی تباہ حالی کا رنج، قوم کی بربادی کا فکر اور مستقبل کی تعمیر کا جنون۔ دراصل اس زمانہ سے بہت پہلے خلافت کی تحریک میں وہ باقاعدہ سیاسی میدان میں آچکے تھے اور

اس وقت تو دُنیا اُنھیں اُس وقت کی مقبول عام جمعیۃ العلماء ہند کے نوجوان گروپ کے ایک سربرآوردہ جز کی حیثیت سے
جانتی تھی۔ ڈابھیل کی زندگی عجیب تھی۔ کھانے پر سب احباب ساتھ بیٹھتے۔ ملکی معاملات و مسائل پر بحث ہوتی۔ مفتی
عتیق الرحمٰن اور مولانا حفظ الرحمٰن کی ایک رائے ہوتی اور مولانا بدر عالم کا کچھ اور خیال۔ بعض وقت بحث طویل ہوجاتی
کھنچ جاتی۔ مولانا مخصوص انداز میں برس پڑتے، بگڑ اُٹھتے، بے تکان بولتے اور بحث و مذاکرہ کا یہ سلسلہ گھنٹوں جاری
رہتا۔ استاذ مرحوم کے یہاں دن میں کئی کئی بار حاضری کا معمول تھا۔ جب آتے علمی مسائل پر استفسار کرتے اور جب
جاتے تو بہت کچھ لے کر جاتے۔ ان کے استاذ کو خود ان کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ باید وشاید۔ استاذ کا دربار دہ تھا کہ
فراست وہوشمندی کو دامن سنبھال کر بیٹھنا پڑتا تھا اور علم وفضل یہاں چوکنے ہوکر آتے اور شرمندہ ہوکر جاتے تھے
ایسے کے دل میں جگہ پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر استاد کے تعلق کا یہ عالم کہ شاید دسمبر ۱۹۳۱ء کے آخر میں مولانا گرفتار
ہوکر جب میرٹھ جیل گئے تو استاذ یہ خبر سن کر تڑپ اٹھے، ہائے وہ شفقت بھرے الفاظ کہ" یہ صاحب عجب
قسم کے آدمی ہیں۔ انہی باتوں میں اپنا وقت خراب کرتے ہیں۔ اب وہاں جا پڑے ہیں خبر نہیں وہاں کیا گذرے اور کس طرح
بسر ہوئے" جب تک جیل رہے استاذ کے دل سے نہیں اترے۔ برابر پوچھتے رہے۔ خط لکھتے رہے، دعائیں یاد رکھتے۔
مولانا میرٹھ جیل سے چھوٹے تو دیوبند آئے۔ یہاں استاذ تھے پہلے ان کی قدمبوسی کی پھر آگے گھر گئے۔ میرٹھ
جیل سے ان کا رہا ہوکر دیوبند آنا نگاہوں میں پھرتا ہے۔ سردی کا زمانہ تھا شام کا جھٹپٹا سا وقت جب مولانا پوری
متانت وسنجیدگی کے ساتھ تانگے سے اترے اور استاد نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔
سیاسی رہ نما اور مقرر کی حیثیت سے آج وہ ہزاروں پر بھاری ہیں مگر درس وتدریس میں بھی ان کا
اپنا خاص رنگ تھا۔

حدیث وتفسیر کی اعلیٰ کتابیں ان کے زیر درس تھیں اور یہ خاص شغف ومحنت سے پڑھاتے تھے۔ ایک سال
مشکوٰۃ شریف آپ کے یہاں تھی۔ عصر کے بعد پڑھاتے تھے طلباء کی بڑی جماعت ہوتی تھی اور سب اس خوش بیان مدرس
کی تقریر پر فدا تھے۔ یہ کم عمر اور بدذوق بچہ بھی تقریر کے جوش وروانی سے محظوظ ہونے کے لیے گھنٹوں سبق میں بیٹھا
رہتا تھا۔ ڈابھیل کی زندگی کے سینکڑوں واقعات ہیں، بدقسمتی سے اب وہ مجلس ہی درہم برہم ہوگئی نہ وہ
مکین رہے اور نہ مکان جن بزرگوں کے فیض سے علم وفضل کی یہ مجلسیں آباد تھیں اور صوبہ گجرات کے ایک دور
دراز گوشہ میں ایک قابلِ رشک علمی ماحول پیدا ہوگیا تھا، وہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔
اَبّاجی مرحوم نے برسہا برس گذرے اس عالم سے کوچ کیا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کئی سال تک دارالعلوم
کی صدارت اہتمام پر فائز رہے اور پھر علم وفضل کے اس آفتاب پر بھی سیاست کی غلیظ بدلیاں چھاگئیں۔ مولانا
سراج احمد رشیدی بھی رخصت ہوئے۔ مفتی عتیق الرحمٰن نے ندوۃ المصنفین کا ڈھانچہ کھڑا کرلیا۔ مولوی سعید احمد صاحب
اکبرآبادی نے برہان کی اڈیٹری شروع کردی۔ مولانا بدر عالم صاحب کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا
تصور آتا ہے تو ڈابھیل کی اس زندگی کے سارے اوراق ذہن میں گھوم پڑتے ہیں۔ کھانے پینے کا کوئی اہتمام
حسب عادت یہاں بھی نہیں تھا۔ کھدّر کے دو چار جوڑے ان کے لیے بہت تھے۔ البتہ صاف ستھری شیروانی اور اچھا
سا جوتا۔ یہ اُن کی مرغوب چیزیں ہیں۔ کھانے میں کوئی خاص ذوق نہیں رکھتے کبھی اگر مانگتے ہیں تو کھانے کے بعد میٹھی
کوئی چیز۔ اُڑد، ان کے ضلع بجنور کی خاص غذا ہے یہی انھیں بھی مرغوب تھی، وہاں کھانے کا ہوش ہی کسے ہے۔

کھانا سامنے آیا اور کوئی بحث چھڑ گئی، اب نہ کھانے کا ہوش ہے اور نہ پانی کا۔ بحث و مباحثہ میں وقت کٹا۔ دسترخوان بڑھا دیا گیا اور دس پانچ نوالے بمشکل حلق سے اترے۔ اسی زندگی کا یہ ایک لطیفہ۔ دوپہر کو مولانا اپنے کمرے میں آرام کرسی پر پڑے ہوئے کتاب دیکھ رہے تھے۔ بخار کا موسم تھا، سردی چڑھی اور بخار حملہ آور ہوا۔ میں سامنے بیٹھا ہوا تختی لکھ رہا تھا۔ مولانا نے کہا کہ ازہر اندر سے لحاف لاکر مجھے اُڑھا دو، سردی لگ رہی ہے، لحاف اُڑھا دیا گیا۔ فرمایا کہ میری کمر سے لگ کر لیٹ جاؤ تاکہ سردی کم ہو، کمر سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ مگر نو دس سال کا بچہ۔ شوخی اور شرارت خاصۂ عمر۔ دس پندرہ منٹ کے بعد طبیعت اس کام سے اکتا گئی اور بھاگنا چاہا۔ انہوں نے جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً لحاف کے اندر ہی آہستہ سے پاؤں میں چونٹی بھرلی۔ مولانا نے مجبوراً بھگا دیا۔

اباجی مرحوم کے ساتھ جب پہلی مرتبہ ڈابھیل گیا تو مولانا اس عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس میں وہ اور ہم سب رہتے تھے۔ کھدّر کا کرتہ۔ پاجامہ۔ اور گاندھی کیپ میرے سر پر تھی اور چپل پاؤں میں۔ مولانا دیکھ کر مسکرائے کہ اخوہ پورے لیڈر بنے ہوئے ہو۔

ڈابھیل کے بعد کئی سال کلکتہ اور امروہہ میں بسر کیے۔ کلکتہ میں تبلیغی خدمت پیشِ نظر تھی اور امروہہ میں درس و تدریس کا مشغلہ۔ اور پھر ۱۹۳۸ء سے دہلی میں مستقل قیام ہے۔ یہاں وقت کا ایک حصہ ندوۃ المصنفین کی نذر ہوتا رہا۔ اور دوسرا جمعیۃ علماء اور کانگرس کے، ندوۃ المصنفین کے وقت میں دس بارہ اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ ڈالیں اور جمعیۃ و کانگرس کے کاموں میں ہزاروں میل کا سفر کیا۔ ہزاروں تقریریں ہوئیں۔ مسلمانوں کی برسہا برس تک گالیاں کھائیں، قاتلانہ حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ غداری کے طعنے سنے، ہندوؤں کے ہاتھ میں بک جانے کی تہمت دھری گئی۔ اخباروں نے ہزاروں صلواتیں سنائیں۔ مخالفین نے تکلیف دینے میں کسر نہ اُٹھا رکھی۔ کچھ وقت ایسے بھی گذرے کہ عزت و آبرو تو الگ رہی جان کی سلامتی بھی مشکل تھی کہ صرف دہلی نہیں بلکہ پورا ملک اور پوری قوم مخالف تھی۔ مگر اپنی زندگی کی وضع میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو رائے کل تھی وہی آج رہی اور جس طرح کل اس کا اظہار ہوتا تھا اسی طرح آج بھی ہوا۔ سچائی ہمیشہ ان کی زندگی کا اصول ہے، طبیعت سچائی کی اس لائن سے ہٹنے پر قادر ہی نہیں رہی وقت نے کتنے ہی دھکے دیئے مگر ان کے قدم میں لغزش نہ آئی۔ قوم نے کتنا ہی بُرا بھلا کہا مگر یہ قوم کا ساتھ نہ چھوڑ سکے۔ قوم اور اس کے ہر ہر فرد سے محبت و خلوص کا یہ عالم کہ دہلی کے ایک لیگی کارکن نے ایک جلسہ میں بر ملا ان پر حملہ کیا۔ مگر اب یہ لیگی لیڈر مجبور و حاجتمند بن کر سامنے آیا تو ادھر سے محبت و شفقت نے اس کا استقبال کیا اور دو سخت لفظوں سے بھی اس کا دل توڑنا گوارا نہ ہوا۔ جلسوں میں کتنی مرتبہ قدر شناس قوم نے اُنھیں گالیاں دیں۔ اسٹیشنوں پر کہاں کہاں ان پر حملے ہوئے۔ چلتے پھرتے کتنے برس تک انھیں دلخراش آوازے سننے پڑے۔ اخبارات نے ان پر کیا کیا گند اچھالا اور اس معصوم فطرت انسان پر جسے یقیناً گناہ کا سلیقہ بھی نہیں آتا جھوٹے الزامات لگائے اس کی تفصیل تو ان لوگوں کو بھی معلوم ہوگی جو سیاسی کام میں ان کے شریک رہے۔ میں تو ایک گوشہ نشین انسان۔ ایسے حوادث سے براہِ راست نہ مجھے کوئی تعلق اور نہ سیاسی اور اخباری دنیا کے ان واقعات پر میری نظر۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ گذشتہ دس بارہ برس مولانا حفظ الرحمٰن نے دفتر جمعیۃ میں چٹائی پر بیٹھ کر گذار دیئے۔ کھانا اس وقت مل گیا تو شام کو ناغہ۔ شام کو مل گیا تو صبح کو غائب۔ جو سامنے آگیا اس پر قناعت اور جو مل گیا اس پر صبر و شکر۔ بس بائیس سال .... غیروں کے مظالم اور

اپنوں کے مصائب سہنے میں گذر گئے مگر پیشانی پر بل نہیں آیا، راستے کی صعوبتوں اور سفر کی تکلیفوں سے گھبرا کر بڑوں بڑوں نے ساتھ چھوڑ دیا مگر حفظ الرحمٰن نے منزلِ مقصود پر ہی آکر دم لیا۔ چاہتے تو امیرانہ زندگی گذار سکتے تھے۔ رزق کے لیے حیلہ اور کوشش کی ضرورت ہے۔ ان امور پر توجہ ہوتی تو کم از کم اپنے بیوی بچوں کے لیے تو اچھی زندگی پیدا کر دیتے مگر یہاں امارت و غربت کا امتیاز ہی کوئی نہیں بقدر لایموت رزق حاصل کرنا اور وقت کا بڑا حصہ مسلمانوں کی خدمت میں بسر کرنا ہی مقصودِ زندگی ہے۔ بیوی اللہ کی کوئی نیک بندی پلے بندھ گئی ہے اسی طرح اولاد بھی شریف ہے جس نے مولانا حفظ الرحمٰن کی ان تمام عادتوں میں ان کا ساتھ دیا اور سارے مصائب میں ان کے شریک حال رہے ورنہ یہی اولاد و کنبہ اور گرہستی اکثر انسان کو ہوس پرستی کا شکار کر دیتی ہے۔ تیسرے سال بڑی لڑکی کی شادی کی تقریب میں سب دوست احباب بلائے گئے۔ ازہر بھی سیوہارہ میں اس موقعہ پر حاضر تھا۔ غریب کے پاس سرمایہ کیا کہ تقریب تقریب کی طرح ہوتی جس نے جوانی کے تمام اوقات جیلوں میں گذار دیئے اور دل و دماغ کی ساری طاقتیں قوم کے سود و بہبود پر خرچ کر ڈالیں اس کی جیب میں نقدی کا کیا سوال؟ مگر دعوت و ضیافت کا جو انتظام تھا اس میں مولانا کی فراخ دلی جھلک رہی تھی۔ دوسروں کی خاطر تواضع اپنی ہمت سے بڑھ کر کی اور ایسی کی کہ اس تقریب سے واپسی پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ نے ریل میں فرمایا کہ "مولوی صاحب نے خواہ مخواہ تکلیف کی، اب قرضدار ہو گئے ہوں گے"

بڑے بوڑھے لوگ کہتے ہیں اور اپنے تجربہ سے بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک آدمی گناہ کرتا ہے تو بعض وقت غضب الٰہی اس کے ساتھ کئی بے گناہوں کو بھی گرفت میں لے لیتا ہے اور کسی ایک کی نیکیاں بسا اوقات بہت سے گناہگاروں کے لیے جائے پناہ بن جاتی ہیں۔ رحمتِ حق نکوکار انسان کی ہمسائگی اور قرب تعلق کی بنا پر اوروں کی بھی رعایت کرتی ہے۔ خود اپنی نظروں سے دیکھا کہ بعض مکانات میں گناہوں کی بھٹی گرم ہوتی ہے۔ سیاہ کاریوں کے شعلے بھڑکتے ہیں فسق و فجور کی لپٹیں اٹھتی ہیں ظلم و تعدی کا تنور دہکتا ہے، ساری فضا گناہوں کے پسینہ سے شرابور ہوتی ہے اور در و بام کی پیشانیاں گناہوں کی زیادتی اور کثرت سے بے رنگ و روغن نظر آتی ہیں مگر ایسے گندے ماحول پر بھی معبود کا غضب نازل نہیں ہوتا اور قدرت اس کی دار و گیر میں ڈھیل دیتی ہے۔ کسی کو نظر آئے یا نہ آئے مگر تحقیق دیکھئے تو قرب و جوار میں ضرور کوئی ایسا فرد موجود ملے گا جس کی خواہشاتِ نفسانی رضائے الٰہی کے سامنے سکڑ اور سمٹ کر رہ گئی ہوں گی اور جس کا سینہ معارف، اسرار الٰہی کا گنجینہ ہوگا جس کی نیکیوں پر فرشتے بھی رشک کرتے ہوں گے اور جس کے سجدۂ عبودیت کے لیے حورانِ بہشتی بھی شوق و بے تابی کے ساتھ اپنی چادریں بچھاتی ہوں گی۔ اس ماحول پر خدا کے رحم اور عفو و کرم کا سبب یہی نیک ذات ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا حفظ الرحمٰن کا وجود مسلمانانِ ہند کی موجودہ نسل کے لیے ایسی ہی رحمت و برکت الٰہیہ کا باعث ہے، یہ سادہ دل، صاف باطن، پاک ضمیر، بلند فطرت اور گرم مزاج کا انسان مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے خود ایک مستقل بشارت اور مستقل نعمت ہے اس کی فطرت گناہوں سے پاک ہے۔ اس کی طبیعت بے ریا ہے۔ قلب صاف و شفاف ہے جس میں دشمنوں اور دوستوں سب کے لیے محبت و خلوص ہے اس کی تحریر میں سادگی ہے سادگی میں بناؤ اور معانی و مضامین کی گہرائی ہے اس کی تقریر ایک ایسا پُرجوش اور پُرشور دریا ہے جو جوش و خروش اور پوری طاقت کے ساتھ بہنے کے باوجود آبادیوں بستیوں اور کھیتیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس کی گفتگو میں گرمی ہے مگر ایسی گرمی جو عام قلوب انسانی کو بلند ارادوں اور بلند خیالات کی حرارت بخشتی ہے وہ جب بولتا ہے تو مکر و فریب کاری کی دنیا پر بجلیاں گرا دیتا ہے اور

سچائی اور عام انسانی ہمدردی کے تمام مدھم حروف اس کی روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ ان کی شخصیت من حیث المجموع ایک شمشیر آبدار ہے جو دشمنوں کو کاٹتی چھانٹتی چلی جاتی ہے اور یہی شمشیر مظلوم دوستوں کے لیے وقت ضرورت سپر کا کام دیتی ہے ان کی زندگی میں نہ شاعرانہ سخن پروری ہے نہ فلسفیانہ نکتہ طرازی اور نہ امیرانہ تنعم پرستی وہ خود عمل پسند ہیں اس لیے ان کے پاس دوسروں کے لیے عمل اور جد وجہد کے سوا کوئی پیغام نہیں۔

میری اپنی نظر میں مولانا حفظ الرحمٰن کی بڑی قیمت ہے اور میں ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ کارساز قدرت مسلمانوں کے اس مخلص خادم کو مزید دولت عمر اور ولولۂ کار عطا فرمائے۔

آہ! مجاہد ملت

از جناب نجم مظفرنگری

رہے گا کندہ ہر گل پر ترا نام و نشاں برسوں
چمن دوہرائے گا تیرے کرم کی داستاں برسوں

یہ سچ ہے رہبری سے جس کی تو نے ہاتھ اٹھایا ہے
بھٹکتا ہی پھرے گا بالیقیں وہ کارواں برسوں

چمن میں اہتمامِ غنچہ و گل تیرے دم تک تھا
نہ گذری تھی کبھی بھولے سے بھی بادِ خزاں برسوں

چمن بندی پہ گو اپنی توجہ منعطف بھی ہے
رہے گا دل مگر بیگانۂ سود و زیاں برسوں

گواہی دے رہی ہے آج بھی تاریخ آزادی
کہ تو بہرِ وطن پھرتا رہا ہے سرگراں برسوں

حریفِ امن و ایماں ہو گئے شعلے حوادث کے
اسی گلزارِ ہستی میں رہا تھا آشیاں برسوں

کہیں یارانِ ساحل جب نہ پائیں گے سکونِ دل
تلاطم خیز موجوں میں رہیں گے سرگراں برسوں

ملیں گے راستے میں گو ہزاروں رہ نما لیکن
نہ آئے گا نظر کوئی حقیقی مہرباں، برسوں

اُترتا جا رہا ہے دل میں تیری یاد کا نشتر
میری آنکھوں سے ہوں گے خون کے آنسو رواں برسوں

تیرے داغِ جدائی سے کمر ٹوٹی ہے ملت کی
تجھے اے حفظِ رحمٰن روئے گا ہندوستاں برسوں

تقاریر ایسی کی ہیں تو نے ایوانِ سیاست میں
رہیں گی پیشِ عالم جن کی معنی خیزیاں برسوں

دُعا ہے رات دن اللہ سے یہ نجمِ گریاں کی
رہے پُر نور محشر تک لحد اس مردِ میداں کی

ڈوبتے ستارے

از مولانا مقبول الرحمن سیوہاروی

نہ ٹوک ان آنسوؤں کو خون سے چمکائے ہیں میں نے
ہزاروں چاند کھو کر یہ ستارے پائے ہیں میں نے

غم و آلام کی صبر آزما منزل سے گذرا ہوں!
میں طوفاں تک پہونچنے کے لئے ساحل سے گذرا ہوں

جنابِ شیخ رح کو کاندھا دیا میرے مقدر نے
غمِ آزاد رح سینہ پر لیا میرے مقدر نے

وفاتِ مفتیٔ اعظم رح کو بھی انگیز کر ڈالا
ان اشکوں میں غمِ احمد سعید آمیز کر ڈالا

اور اب اے حفظِ رحمان تیرا ماتم کر رہا ہوں میں
مقدر کو نئی گردش سے محرم کر رہا ہوں میں

یہ سب کچھ کیا ہے اس کا ماحصل پہچانتا ہوں میں
نتائج کیا اشارہ کر رہے ہیں جانتا ہوں میں

سمجھتا ہوں کہ قسمت کا ستارہ جھلملاتا ہے
ستارہ جھلملا کر موت کا پیغام لاتا ہے

یہ میں بھی جانتا ہوں مجھ کو رونا چاہیئے ہمدم
شریکِ ماتمِ تقدیر ہونا چاہیئے ہمدم

مگر میں اور ہی تعبیر لیتا ہوں ستاروں سے
میں کیوں مایوس ہو جاؤں مشیت کے اشاروں سے

ستارے جھلملاتے ہیں تو یوں ہی جھلملانے دے
نہ روک اے کوشش ناکام ان کو ڈوب جانے دے

تو کیا جانے کہ ان کے ڈوبنے کے بعد کیا ہوگا
ستارے ڈوب جائیں گے سحر کا چاندنا ہوگا

زمانہ مسکرائے گا سحر کے مسکرانے پر
سحر موقوف ہے لیکن ستارے ڈوب جانے پر

مرقعِ اوصاف و کمالات

از
مولانا ظفیرالدین صاحب مفتاحی

۱۹۳۹ء میں صوبہ بہار جمعیۃ علماء کانفرنس دربھنگہ شہر میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔ یہ مسلم لیگ کے شباب کا زمانہ تھا، جہاں دیکھئے جسے دیکھئے وہ یہ گاتا نظر آتا تھا "و مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔

چنانچہ شہر دربھنگہ اور اس کے اطراف و جوانب بھی اس وبا سے پاک نہ تھے، جمعیۃ علماء کی صوبائی کانفرنس کی مخالفت جس شد و مد سے لیگ کی طرف سے ہو سکتی تھی ہوئی، کوئی شبہ نہیں کہ عوام میں زیادہ تر لوگ لیگ کے ماننے والے تھے، مگر پڑھے لکھے طبقہ میں جمعیۃ علماء سے وابستہ لوگوں کی بھی کمی نہ تھی، بالخصوص مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے اساتذہ اور طلبہ سارے کے سارے جمعیۃ سے متعلق تھے۔ اور سچ پوچھئے تو یہی مدرسہ جمعیۃ کی چھاؤنی تھا، خاکسار اس جلسہ میں ایک رضا کار کی حیثیت سے شریک تھا، اس عظیم الشان جلسہ میں جہاں اور علماء مدعو تھے، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی مدعو تھے،

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر دوسرے دن، رات کے اجلاس میں ہوئی، یہ پہلا دن تھا جس میں میں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ایک تماشائی یا رضا کار کی حیثیت سے دیکھا، مجھے اب تک خوب اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا مرحوم نے جوں ہی تقریر شروع کی، مجمع پر سناٹا چھا گیا، شاید اس قدر تیز اور برجستہ بولنے والا بہت سے لوگوں نے پہلی مرتبہ دیکھا، آپ کی تقریر فراٹے بھرتے ہوئے دریا کے پانی کی طرح رواں و شستہ تھی،

آپ نے تقریر شروع کرنے سے پہلے اعلان عام کر دیا تھا کہ مجمع میں جس شخص کو جو اعتراض یا اشکال ہو، وہ لکھ کر میرے پاس بھجوا دے، انشاء اللہ ان تمام اشکالات کا برجستہ تقریر ختم کر کے جواب دیا جائے گا۔

ڈیڑھ دو گھنٹہ مولانا کی تقریر ہوئی، درمیان تقریر میں پرچیاں آتی رہیں اور صدر اجلاس کے پاس جمع ہوتی رہیں تقریر ختم کر کے آپ نے ان پرچیوں کو آواز کے ساتھ پڑھ کر مجمع کو سنانا شروع کیا، تمام پرچیوں کو سنانے کے بعد آپ نے اعلان کیا، ان سب کی روشنی میں یہ آٹھ اشکالات ہیں، جو مختلف حضرات کے لئے باعثِ الجھن ہیں۔ اب ان کا یکے بعد دیگرے جواب سنئیے۔ اتنا کہہ کر پھر اسی روانی کے ساتھ برجستہ ایک ایک سوال کا مدلل و مبرہن جواب دیا۔ پورا مجمع ہمہ تن گوش تھا، اور حیرت زدہ، کہ جو اشکالات عرصہ سے ہمارے لئے باعثِ خلجان تھے ان کا تار و پود کس خوبصورتی اور مضبوطی سے مولانا بکھیرتے چلے جا رہے ہیں۔

جب تمام اعتراضات و اشکالات کے مسکت جواب دے چکے تو آپ نے پھر اعلان کیا کہ اگر کسی کو کوئی شبہ اور رہ گیا ہو تو وہ بلا تکلف پیش کرے۔ مگر مجمع پر سکوت کا عالم طاری تھا، کسی گوشہ سے کوئی آواز

نہیں اٹھی، مولانا کی تقریر جس وقت ہو رہی تھی، پورا مجمع جھوم رہا تھا اور ہر دس پندرہ منٹ کے بعد نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر، جمعیۃ علماء زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے، اسٹیج پر بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ سبھوں پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی، شیخ الاسلام مولانا مدنی رح، حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد بہاری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابو القاسم سیف بنارسی۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الوہاب در بھنگوی، مولانا نور الدین بہاری اور دوسرے بیسیوں علماء رونق افروز تھے،

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی اس رات میں یہ پہلی تقریر تھی، آپ کے بعد تقریر کے لیۓ مولانا امین احسن اصلاحی اسٹیج پر تشریف لائے، اُس زمانہ میں مولانا اصلاحی سنجیدہ بولنے والوں میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ خاکسار اس سے پہلے ان کی تقریر چھپرہ شہر میں اس سے گذشتہ سال صوبائی ہی کانفرنس میں سن چکا تھا، توقع تھی کہ مولانا اصلاحی کا رنگ جم جائے گا اور یہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے بعد تقریر نباہ لے جائیں گے مگر یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ مولانا اصلاحی پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں بول سکے اور بیٹھ گئے، چونکہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی تقریر بہت کامیاب ہو چکی تھی اس لیۓ کسی دوسرے مقرر کی تقریر کا جم جانا آسان نہ تھا، بالآخر مولانا احمد سعید صاحبؒ کو کھڑا کیا گیا۔ اپنے زمانہ میں مولانا احمد سعید تقریر کے بادشاہ کہے جاتے تھے، اور اس دن یہ بات ثابت ہو کر رہی کہ مولانا احمد سعید صاحبؒ نے تقریر کی اور کوئی تین گھنٹے کی، اور مجمع اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

پھر اس کے بعد متعدد مرتبہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رح کی تقریریں سننے کا موقع ملا، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دفعہ میں نے پہلے سے بڑھکر اثر قبول کیا اور غالباً یہی حال دوسرے سامعین کا بھی ہوتا ہوگا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی تقریر مولانا کی مونگیر شہر میں سننے کا موقع ملا، اس دوران کے اجلاس میں مولانا کی دو تقریریں ہوئیں، ایک سیرت النبیؐ پر اور ایک جمعیۃ اور ہندوستان کی آزادی پر، دونوں تقریریں بہت زیادہ کامیاب ہوئیں اور ہندو مسلمان بے حد متاثر ہوئے۔

تقریر میں جہاں روانی، برجستگی ہوتی تھی وہیں تقریر مدلل اور مؤثر بھی ہوتی تھی، کیا مجال مولانا کی تقریر کے درمیان کوئی اُٹھنے کا نام بھی لے سکے، یہ بات بلا شک وشبہ کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کی تقریر سے مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں، مایوسی آس میں بدل گئی، اور پژمردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، مولانا نے اس زمانے میں جہاں جہاں پہونچ کر تقریر کی۔ مسلمانوں کے حوصلہ بلند ہو گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اب تک ہم تاریکی میں تھے۔ اس ملک کی آزادی میں ہمارا کسی سے کم حصہ نہیں ہے بلکہ بعض اعتبار سے دوسروں سے بہت زیادہ، پھر گھبرانے، ڈرنے اور احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ مسلمانوں میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ وہ ان طعنہ دینے والوں کو برجستہ جواب دینے لگے، جو مسلمانوں کو پاکستان جانے کا طعنہ دیا کرتے تھے، اور اس جرأت وہمت کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ برادرانِ وطن کے متعصب حضرات کی زبانیں بند ہو گئیں۔

سچ پوچھیۓ مولانا اپنے شاندار کارناموں، اپنی بے باکی وصاف گوئی اور ایثار وقربانی میں کسی سے پیچھے نہ تھے، بلکہ بہت حضرات سے آگے اور بہت آگے، شیخ الاسلام حضرت مدنی رح کے براہِ راست معتمد تھے، ساری جمعیۃ مولانا حفظ الرحمٰن سے وابستہ تھی، جہاں دیکھیۓ اور جس کسی کی مدد میں دیکھیۓ حفظ الرحمٰن تن تنہا سب سے آگے نظر آتے وہ جو مکھی لڑائی لڑنے والے جرنیل تھے، ایک طرف حکومت اور اس کے افسران سے برابر ٹکر لیتے رہے اور کسی

رچہ پر پیچھے قدم ڈالنا انہوں نے حرام سمجھا، دوسری طرف ان مسلمانوں کو سہارا دیا، جن کو ہندو اپنی مضبوط سازش سے یہاں سے نکلوانا چاہتے تھے، تیسری طرف ان مسلمانوں کا جواب بھی دیتے تھے جو اب تک جمعیۃ اور نیشلسٹ مسلمانوں کو گالیاں دیتے رہتے ہیں، اور چوتھی طرف مذہبی تعلیم کا بنیادی فریضہ بھی کبھی فراموش نہیں کیا، بلکہ اس کے لیے کتابیں لکھواکر شائع کیں، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں انھیں رائج کرایا۔

بمبئی میں ایک آل انڈیا دینی کانفرنس بلائی جس میں ہر مکتب فکر کے مسلمانوں کو دعوت دی، اور سبھوں کو دینی تعلیم کے مسئلہ پر سر جوڑ کر کسی فیصلہ تک پہونچنے کے لیے مجبور کیا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کی ان خدمات کے نتائج خوشگوار اور مفید ثابت نہ ہوئے۔ اگر ملک میں مولانا جیسے دو چار اور خدمتِ دین کا جذبہ رکھنے والے مجنوں پیدا ہوجاتے اور وہ مولانا کے ساتھ ہوکر عملی طور پر ان کا ہاتھ بٹاتے تو یقینی طور پر ملک کا رُخ کچھ اور ہوتا، اور مسلمان جس پستی میں نظر آتے ہیں اس سے نکل کر کسی بلند مقام پر نظر آتے۔

جبل پور فساد کے سلسلہ میں مولانا مرحوم کو جن تجربات سے گذرنا پڑا، اس نے مولانا کو جھنجھوڑ دیا تھا، اور مولانا پوری پامردی سے یہاں کی حکومت کو بتادینا چاہتے تھے کہ یہاں کی اقلیت پر جو کچھ مظالم ہورہے ہیں حکومت اس سے بخوبی واقف ہے مگر کچھ کرنا نہیں چاہتی، غنڈوں اور متعصب فرقہ پرست افراد کو اس نے چھوٹ دے رکھی ہے، اور یہی وجہ تھی کہ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، تو مولانا مرحوم نے پارلیمنٹ میں کھڑے ہوکر اس مسئلہ پر برجستہ تقریر کی اور جو زیادتی اور ناانصافی مسلمانوں کے ساتھ کی جاتی ہے اس کی نشاندہی کی، جبل پور کے فساد پر مفصل روشنی ڈالی، اور اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کی، کہ کوئی مجھ سے خفا ہو جائے گا، یا کچھ لوگ میرے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑجائیں گے، مگر جو بیان دیا وہ بالکل صحیح اور مدلل، ایسا مدلل ومسکت کہ کوئی کسی جملہ کی تردید کرنے کی بھی جرأت نہ کرسکا۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے مسلم کنونشن طلب کیا۔ کچھ بدخواہوں نے ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اربابِ حکومت سے کنونشن پر پابندی عائد کرانے کا ارادہ کرلیا، جیسا کہ وزیرِ داخلہ کی اس تقریر سے ظاہر ہے جو انہوں نے مجاہد ملت کے تعزیتی جلسہ میں کی ہے، لیکن مجاہد ملت ایسے موقعہ پر دبنے والے کب تھے، انہوں نے اعلان کردیا کہ کنونشن ہوکر رہے گا، اربابِ حکومت سے ملاقات کی، اور انھیں سمجھایا کہ مسلم کنونشن کی کیا ضرورت ہے اور کیوں آپ حضرات کو اس کی مخالفت نہ کرنی چاہیئے، اور بالآخر مولانا اپنی بات منواکر رہے اور دہلی میں مسلم کنونشن منعقد کیا۔ مسلمانوں سے متعلق مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی اور اصلاح حالات کے لیئے تجویزیں پاس ہوئیں۔

فرقہ پرست ہندو اسی وجہ سے حضرت مجاہد ملت سے ادھر بہت جلنے لگے تھے، بعض کانگریسی وزیروں نے بھی آپ سے الجھنا چاہا، کچھ مسلمانوں نے بھی مسلم کنونشن کو بہانہ بناکر مخالفانہ بیان دیا، شاید کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو مسلم کنونشن کے بعد جو بیانات دیئے گئے تھے یا چرن سنگھ نے جس طرح چھیڑنا چاہا تھا وہ خاموش ہوجاتا مگر دنیا جانتی ہے مولانا تن تنہا سب کا جواب دیتے رہے، اور جواب بھی اس انداز کے کہ بیان دینے والا بھی ایک دفعہ گھبرا اُٹھے کہ یہ میں نے کیا کہا،

انتخاب کا جب موقع آیا تو فرقہ پرستوں نے حضرت مجاہد ملت کو شکست دینے کے لیئے ہزاروں جتن کیئے، خود

نادان مسلمانوں کے ایک محدود طبقہ نے بھی مخالفت کی اور بڑی زور آزمائی کی، گو غیر کانگریسی ہندو مسلمان دونوں نے مل کر مولانا کو گرانا چاہا، مولانا بیمار بمبئی میں پڑے ہوئے تھے، مگر یہ مولانا کی خدمات اور اخلاص کا صلہ تھا کہ ہندؤں اور مسلمانوں کے سمجھدار طبقہ نے پوری جدوجہد کرکے مولانا کو بڑی اکثریت سے کامیاب بنایا، یہ مجاہد ملت کی مقبولیت کی دلیل تھی۔

مولانا کے اخلاص کے سلسلہ میں کبھی دورائیں نہیں ہوسکتیں، ان کے کسی طریقۂ کار سے کسی کو اختلاف ہو تو ہو مگر مولانا کی سچائی، صاف گوئی، بے باکی، جرأت اور خلوص سے کوئی مخالف سے مخالف بھی انکار نہیں کرسکتا، اپنی زندگی میں مولانا نے لاکھوں مظلوموں کی حمایت کی، ہزاروں غریبوں کو سہارا دیا، اور سیکڑوں مصیبت زدوں کی مصیبتیں دور کرنے کے لیئے دن رات ایک کردیا، ان کی نظر میں امیر غریب، بڑے چھوٹے اور ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہ تھی، سب کی یکساں مدد کرتے تھے، اور سبھوں کی مدد کے لیئے ہر آن آمادہ رہتے تھے۔

مولانا اس وقت علماء دیوبند اور اسلاف کرام کے واحد نمائندہ ہونے کی حیثیت رکھتے تھے، سبھوں کو آپ پر صرف اعتماد ہی نہ تھا، بلکہ آپ سے عقیدت تھی، محبت تھی اور یقین تھا کہ آپ جو کچھ کریں گے انشاء اللہ ملت کے حق میں وہ کام اچھا ہی ہوگا۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رح جس طرح سیاسی رہنما اور پیشوائے دین کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح آپ کا مقام علم وعمل میں بھی تھا، آپ ایک کامیاب مدرس، باکمال مفسر اور مشہور مصنف بھی تھے، سیاسی انہماک سے پہلے آپ نے جو علمی دینی کتابیں تصنیف کی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا علم کتنا ٹھوس، معلومات کس قدر وسیع طرزِ استدلال کتنا دلنشین، اور زبان وبیان میں کتنی دلربا سلاست وروانی، آپ نے جہاں ملک کی آزادی میں قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، مشقتیں اٹھائیں اور ملک کو آزاد کرایا، آپ کا درجہ اسی طرح علمی میدان میں بھی بہت بلند تھا، اگر آپ تصنیف وتالیف کے لیئے اپنے آپ کو وقف کردیتے تو سیکڑوں نایاب کتابیں آپ کے قلم سے ملک وملت کے مطالعہ میں آچکی ہوتیں، سیاسی انہماک کی وجہ سے علمی مشغلہ جاتا رہا تھا اور برائے نام ہی باقی رہ گیا تھا، ورنہ دن رات ملک وملت کے لیئے پورے ہندوستان میں دوڑتے رہتے تھے، جہاں کہیں سے کوئی خبر آتی آپ فوراً وہاں پہونچنے کی کوشش کرتے، راحت وآرام کی فکر، نہ سونے لیٹنے کا انتظام، نہ اپنی صحت پر دھیان، ان سب سے کٹ کر بس ایک دھن تھی، ملک وملت کی خدمت، عدل ومساوات کا پرچار، مظلوموں کی حمایت، جہاں دیکھیئے مولانا انہی کاموں میں مصروف نظر آتے۔

خاکسار جب دارالعلوم آیا تو مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، مولانا کی وقعت دن بدن بڑھتی چلی گئی جب کبھی ملاقات ہوتی بڑی محبت وشفقت سے ملتے، حالات دریافت کرتے، اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

مولانا مرحوم کو دارالعلوم اور اس کے طلبہ سے والہانہ تعلق تھا، بلا تکلف جو طالب علم بھی چاہتا آپ سے ملتا، اگر اسے اپنے سلسلہ میں کچھ کہنا ہوتا، آزادی کے ساتھ کہتا، مولانا اس کی ساری باتیں غور سے سنتے، اور پھر اس کی تکلیف دور کرنے میں جو مدد بھی ممکن ہوتی اس سے دریغ نہ فرماتے، مختلف کاموں کے لیئے لڑکے آپ سے سفارشیں لکھواتے اور کبھی آپ انکار نہ فرماتے، کسی کے لیئے کمرہ کی سفارش فرماتے، کسی کے داخلہ کی سعی

کرتے۔ کسی کے ساتھ اگر کوئی نا انصافی ہوئی اور مولانا کو علم ہوتا تو اس کے خلاف احتجاجی خط لکھتے اور ذمہ داروں کو صحیح صورتِ حال سے واقف کرتے اور لکھتے یہ معاملہ اس طرح طے ہونا چاہیئے، تاکہ کسی کی کوئی حق تلفی نہ ہونے پائے، آپ کی نظر کبھی اس طرف نہ گئی کہ میں اتنا اونچا ہوں معمولی باتوں کے لیئے کیا سفارش کروں، بلکہ کسی کا درد دُکھ سن کر تڑپ جاتے، پہلے اس کو تسلی دیتے، پھر بتاتے یہ معاملہ اس طرح پیش کرنا چاہیئے، اس طرح دلائل فراہم ہونے چاہئیں، اور پھر میں بھی یہ کارروائی کروں گا اور جب تک آپ اس شخص کا کام انجام نہ دیدیتے چین سے نہ بیٹھتے،

دارالعلوم کے مدرسین وملازمین سے خاکسار نے متعدد واقعات ایسے سنے ہیں کہ اگر کسی ملازم یا مدرس کو کوئی الجھن پیش آتی، باہمی نزاع کی وجہ سے کوئی کسی کو گرانا چاہتا تو سیدھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، اپنی رودادِ غم سُناتا، مولانا سنجیدگی سے سنتے اور پھر خاموشی کے ساتھ اس کی الجھن کو دور کرنے کی مسلسل جد وجہد کرتے، اور اسے باہمی کشمکش سے نکال کر مضبوط بنیاد پر گامزن کر دیتے، کسی کا تقرر ہوتا یا کسی کا استقلال، کسی کی ترقی کا مسئلہ ہوتا یا کوئی اور بات، مولانا ہر موقع پر کھڑے ہوجاتے، بیسیوں کی ترقی واستقلال میں آپ نے مدد پہونچائی اور اس طرح ان کو سہارا دیا۔ اپنا یقین ہے کہ مولانا نے اپنی ذات سے کبھی کسی کو کوئی معمولی نقصان بھی نہیں پہونچایا ہوگا، دل میں بدظنی اور کینہ پروری کا نام ونشان تک نہ تھا، کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہونچتی تو اسے پی جاتے، کبھی زبان پر شکوہ نہ آتا، مولانا دلوں کو جوڑنا جانتے تھے، توڑنا جرمِ عظیم تھا، اور اسے کسی کے لیئے بھی پسند نہیں کرتے تھے، جمعیۃ کے دفتر میں موافق ومخالف سارے ہی لوگ پہونچتے تھے، سبھوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرتے، محبت وشفقت سے ملتے۔ ضرورتیں دریافت کرتے اور ہر امکانی مدد پہونچاتے،

یہ تو ہوتا تھا کہ اگر کسی اہم کام میں پریشان ہوتے اور کوئی ناسمجھی میں اس وقت سر ہوجاتا تو اسے ڈانٹتے اور بسا اوقات جھڑکتے بھی، مگر آپ کی ڈانٹ اور جھڑک میں بھی پیار ہوتا اور یہی وجہ تھی کہ کبھی کوئی بدظن ہوکر وہاں سے بھاگتا نہ تھا، بلکہ دوسرے وقت پھر حاضر ہوکر عرض کرتا، اب مولانا پُرسکون ہوتے خندہ پیشانی سے ملتے اور اس کا کام اس کی توقع سے بہت بڑھکر انجام دیتے۔ چنانچہ یہ بات مشہور تھی کہ مولانا جسے ڈانٹ دیں سمجھ لو اس کا کام ہوکر رہے گا، خواہ انھیں جتنی بھی اس سلسلے میں تکلیف اُٹھانی پڑے، بات یہ تھی کہ مولانا کی طبیعت میں خلق ومروّت اور اخلاص وایثار تھا، کسی ذہنی پریشانی کے وقت خفا سے ہوجاتے۔ مگر جوں ہی وہ اثر زائل ہوتا اس کی دل دہی اپنا فرض سمجھتے، غالبًا دل میں یہ خیال آتا ہوگا کہ کہیں اسے میری باتوں سے کوئی تکلیف تو نہ پہونچی، اس لیئے دوسرے وقت اس کی تلافی کی کوشش کرتے، اور کیا عجب خود بھی سوچتے ہوں، کیوں مجھے اس وقت خواہ مخواہ غصّہ آگیا۔

دارالعلوم سے مولانا کا بڑا گہرا تعلق تھا، کہ یہیں کے فرزند تھے، آپ کو قریب سے دیکھنے والوں کی یہاں کمی نہیں مگر کبھی کسی سے آپ کے متعلق یہ سننے میں نہیں آیا کہ مولانا نے اس کے ساتھ بے مروتی کا معاملہ کیا ہو، یا اُس کی ضرورتوں میں کام آنے سے انکار کردیا ہو یا سامنے کچھ کہدیا ہو اور پیچھے کچھ۔ مولانا کا ظاہر و باطن یکساں تھا، جو دل میں ہوتا، وہی زبان پر لاتے، جو سامنے کہتے وہی پیچھے کہتے، حدیث میں مسلمان کی تعریف آئی ہے:-

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ۔ (ترجمہ) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

مولانا مرحوم پر یہ تعریف پورے طور پر صادق آتی تھی، کبھی کسی کو نقصان پہونچانے کا وسوسہ بھی شاید آپ کے دل میں نہ گزرا ہو۔ آپ نے اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ بھی جو کچھ سلوک کیا، وہ اب بھی جاننے والے جانتے ہیں۔

مولانا کے ذہن و حافظ کا جوہر اس وقت کھلتا تھا، جب کسی آل انڈیا اجلاس میں کسی تجویز پر ملک کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے نمائندے اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور اس میں ترمیم پیش کرتے، ایک تجویز پر دس دس ترمیمیں آتیں، بہترین دل و دماغ والے اپنی ترمیم پر مدلل بولتے، اور ان حضرات کی تقریر کے وقت معلوم ہوتا کہ ان میں فلاں فلاں صاحب کی ترمیم حق بجانب ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ مگر مولانا اخیر میں کھڑے ہوتے اور ایک ایک ترمیم کا مفصل جواب دیتے، فلاں صاحب نے یہ دلیلیں دی ہیں، ان کا ایسا سمجھنا اس طرح غلط ہے، ان کی یہ دلیل اس طرح بے موقع ہے، اس ترمیم کا یہ نقصان ہے، مسلسل دسیوں آدمیوں کی مدلل تقریریں یاد رکھنا اور سب کا برجستہ جواب دینا کوئی آسان کام نہیں اور نہ ہر ایک کے بس کی بات، اور بارہا دیکھنے میں آیا کہ مولانا کی تقریر کے بعد سارے لوگ بخوشی اپنی اپنی ترمیمیں واپس لے لیتے، اور کسی کو پھر کوئی اشکال باقی نہ رہتا۔

سیاسی و دینی بصیرت دونوں ہی مولانا کو حاصل تھیں، اور کبھی اس سلسلہ میں ذہن و دماغ خیانت نہ کرتا ہمیشہ وہی راستہ صحیح ہوتا، جس کی طرف مولانا کا دماغ جاتا، غلطی بہت کم ہوتی، اس لیۓ آپ کے بڑوں کو بھی آپ کے فکر پر اعتماد تھا۔

آزاد ہندوستان میں فرقہ پرست ذہنیت رکھنے والے خواہ وہ کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی، جب کبھی مسلمانوں پر زبان درازکرتے، مولانا ایک لمحہ بھی ایسی بات برداشت نہ کرتے، خواہ وہ کانگریس کا ہی اجلاس کیوں نہ ہو، وہیں کھڑے ہوکر برجستہ اور زور دار جواب دیتے، اور پوری جرأت و دلیری کے ساتھ، اسی طرح اگر اخبارات کے ذریعہ کوئی اس طرح کی اطلاع ملتی تو آپ فوراً بیان دیتے اور اس کی غلط فہمی دور کرنے کی سعی کرتے، آپ نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں تقریریں کیں، اور ہر جگہ اعلان کیا کہ ہمارے اکابر اور خود ہماری قربانیاں کسی سے کم نہیں، اس لیۓ اس ملک میں جو حق جواہر لال کو ہے وہی حفظ الرحمٰن کو بھی حاصل ہے۔ ملک کی تقسیم کانگریس کے نیتاؤں نے قبول کر کے ہمیں مجبور کر دیا، ہم نے کبھی اسے قبول نہیں کیا، اس لیۓ اس سے پیدا شدہ حالات پر ہمیں کوئی ملامت کرنے کا حق نہیں رکھتا، یہ ساری ذمہ داری ان کے سر ہے +

آہ مجاہدِ ملّت

خُلقِ حسیں کا حامل و خوگر چلا گیا — انسانیت کا ماہِ منوّر چلا گیا
قوم و وطن کا مردِ دلاور چلا گیا — ملّت کا وہ مجاہد و رہبر چلا گیا
طوفان و حادثات سے ہارا نہ جو کبھی — بحرِ حیات کا وہ شناور چلا گیا
مضبوط تھا چٹان کی مانند جس کا عزم — طوفاں سے کھیلتا وہ دلاور چلا گیا
جس نے اٹھائیں قیدِ الم کی اذیتیں — وہ باہمی خلوص کا مظہر چلا گیا
جس کا یہ احتجاج رہا ظلم کے خلاف — مظلوم کا وہ حامی و یاور چلا گیا
جس کو رہا زباں کا علالت میں بھی خیال — اُردو کا وہ خطیبِ سخنور چلا گیا
وہ دردمندِ ملّتِ انساں نہیں رہا — اُٹھتے ہوئے جو شعلوں میں اکثر چلا گیا
وہ ایک کامیاب مُقرّر نہیں رہا — چھا جائے جو دلوں پہ وہ پیکر چلا گیا
وہ اک حسیں مرقع تھا روحانیات کا — محبوبِ چشمِ بانیٔ کوثرؐ چلا گیا
دنیا کسے مجاہدِ ملّت کہے گی اب؟ — جانِ عزیز و محسنِ اکبر چلا گیا
رویا کریں گے شام و سحر جس کی یاد میں — وہ یادگارِ مدنی و جوہر چلا گیا
وہ افتخارِ گاندھی و آزاد چل بسا — ہندوستاں کو ناز تھا جس پر چلا گیا
جہد و عمل کا نام ہے دراصل زندگی — دنیا کو یہ پیام سنا کر چلا گیا

مرگِ الم حیاتِ تمنّا کا نام ہے
افسانہ زندگی کا یہیں بس تمام ہے

از: ندیم مرادآبادی

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ

از
مفتی جمیل الرحمٰن صاحب
نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

محترم مدیر "مشرب"، کا ارشاد ہے کہ میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر مجاہد ملت کے حالاتِ زندگی سپرد قلم کروں لیکن یہ ایسا موضوع ہے کہ بے شمار رسائل اور جرائد میں اس پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ تاہم مدیر مشرب کے ارشاد کے پیشِ نظر کچھ تحریر کیا جاتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے ہم وطن بھی تھے اور مخصوص تعلقات کی بنا پر مجھے ابتدائے ہوش سے ہی ان کو بہت قریب سے دیکھتے رہنے کا مسلسل موقعہ بھی ملتا رہا ہے چنانچہ اپنی اس دیرینہ واقفیت کی بنا پر میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی وفات حسرت آیات سے نہ صرف یہ کہ ہم ملک وملت کے ایک عظیم راہ نما جلیل القدر مفکر، بلندپایہ مصنف اور وسیع النظر عالم نیز بے مثل خطیب اور نامور ادیب سے محروم ہوگئے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی، ایک پیکر وفا، مجسمۂ ایثار شخصیت بھی ہم سے ہمیشہ کے لیئے رخصت ہوگئی ولله ما اخذ وله ما اعطی۔

اس موقعہ پر قلب مضطر کا بے اختیار تقاضہ ہوا کہ ان کی یاد میں سوانح حیات کے چند واقعات قطرات غم کے طور پر نذر قرطاس کروں، پیش نظر یہ غیر مربوط سطور اسی اضطراب دلی کا نتیجہ ہیں۔

حضرت مولانا کا اصل اسم گرامی معزالدین تھا، آپ کے سب سے بڑے بھائی ڈپٹی فخرالدین صاحب ہیں جو اب بھی بقید حیات ہیں منجھلے بھائی مولوی بدرالدین صاحب وکیل تھے جن کا انتقال ہوچکا، ان سے چھوٹے مولانا تھے، مولانا سے چھوٹے حکیم صلاح الدین صاحب ہیں جو ضلع بجنور کے مشہور اور حاذق اطبا میں سے ہیں "حفظ الرحمٰن" مولانا کا تاریخی نام تھا جو اصل نام پر غالب ہوچکا تھا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کے تاریخی نام میں رحمان کے رسم الخط میں الف شامل ہے۔ اس طرح مولانا کا سنِ ولادت ۱۳۱۸ھ ہے۔

آپ کے والد ماجد حاجی شمس الدین صاحب قصبہ سیوہارہ کے مشہور زمیندار اور معززین میں سے تھے، اور علمائے حق اور اکابر اہل اللہ کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہتے تھے، حاجی صاحب مرحوم حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس سرہٗ سے بیعت تھے، خاندانی اعتبار سے مولانا صدیقی النسل تھے۔ مولانا کا خاندان ہمیشہ سے علمی خاندان رہا اور نامور علماء وادباء آپ کے خاندان میں ہوتے چلے آئے ہیں۔ مولانا کے والد ماجد حاجی صاحب مرحوم نے مولانا کو ہونہار اور ذہین دیکھکر ارادہ کیا کہ مولانا کو علوم عربیہ کی تعلیم دلائی جائے چنانچہ یہ انتخاب نتیجہ خیز ثابت ہوا، شروع میں اپنے مکان ہی کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے

بعد کچھ تعلیم شاہی مسجد مراد آباد میں حاصل کی، ازاں بعد دورۂ حدیث تک مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں مشغول تعلیم رہے اور دورہ حدیث کی تکمیل حضرت مولانا سید عبدالغفور صاحب سیوہاروی تلمیذ رشید سید العلماء مولانا سید احمد حسن صاحب امروہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے کی۔

اس کے بعد مولانا مرحوم از ہر ہند دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور بحرالعلوم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم سے دوبارہ دورۂ حدیث وغیرہ کی تکمیل فرمائی اور اپنی مخصوص ذکاوت کی بنا پر ان اکابر کے مخصوص تلامذہ میں آپ کا شمار ہوا، مولانا کی ایک خصوصیت جو کم حضرات کو حاصل ہو سکی ہے یہ ہے کہ ابتدائے طالب علمی سے لے کر انتہائے تکمیل تک تمام اساتذہ آپ پر بے حد مہربان رہے ہیں اور آپ ہر ایک کی خصوصی توجہات کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ حضرت مولانا پر حضرت حق جل مجدہ کا یہ بھی خاص انعام تھا کہ وقت کے اہل اللہ کو آپ سے دلی تعلق رہا ہے۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ تقریباً دس بارہ سال ہوئے سیوہارہ میں احقر کے غریب خانہ پر عارف باللہ شیخ اکمل حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہ رونق افروز تھے، مجلس میں مولانا کا ذکر آگیا، حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ فسادات کے زمانہ میں دہلی کے اندر مسلمانوں کے بچانے کے سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے جو خدمات انجام دی ہیں۔ میں ان کے بدلے میں اپنی پوری عمر کے اذکار و اشغال نثار کرنے کو تیار ہوں۔ الفاظ میں شاید فرق ہو لیکن مفہوم یہی ہے۔ اللہ اکبر ایک عارف باللہ شیخ کامل کا یہ ارشاد حضرت مولانا کی عنداللہ مقبولیت کی کس درجہ اہم سند اور شہادت ہے۔

خوب یاد ہے کہ ایام طالب علمی میں صبح کے وقت مولانا مدرسہ فیض عام میں تشریف لائے اور حضرت الاستاذ حافظ احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو ایک صاحب نسبت بزرگ بھی تھے۔ اپنا تازہ خواب بیان کیا کہ آفتاب آہستہ آہستہ نیچے اتر کر میرے سامنے آگیا ہے اور میں اس کو نگل گیا ہوں۔ حافظ صاحب نے فیضانِ علم کی بشارت دی۔

حضرت مولانا میں ابتداء ہی سے خدمتِ خلق بالخصوص بے کس و بے بس مخلوق کی خدمت کا بے پناہ جذبہ موجزن رہتا تھا، اور جب بھی کسی عام یا خاص پریشانیوں کا زمانہ آتا تھا، مولانا پوری جاں بازی و جاں نثاری کے ساتھ خود کو پیش کر دیا کرتے تھے۔ یہی جذبہ آئندہ چل کر ملکی و ملی تحریکات میں ان کی قیادت اور پیش پیش رہنے کا باعث ہوا۔

غالباً مولانا کے ایام طالب علمی ہی کا یا اس کے کچھ بعد کا واقعہ ہے کہ سیوہارہ میں ایک نومسلم جذامی کے انتقال کی پولیس نے اطلاع دی۔ مولانا چند اشخاص کو ساتھ لے کر کوڑھی بستی میں پہونچ گئے۔ مرحوم نومسلم کی یہ دردناک کیفیت دیکھنے میں آئی کہ اعضاء بدن بڑی حد تک جذام سے گل چکے تھے، اور اس قدر بھیانک نقشہ تھا کہ ہر کوئی پاس جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ مولانا نے ایک سقہ کو پانی لانے کے لیئے مامور کیا، اور کپڑے کے دستانے پہن کر بسم اللہ ثقۃً باللہ، کہکر بلا تکلف غسلِ مسنون دینا شروع کر دیا، سقہ دُور سے پانی کی دھار چھوڑ رہا تھا اور مولانا اور ایک دو شخص ان کے ساتھ پورے اطمینان سے اپنے

ہاتھوں سے اس کو غسل دے رہے تھے اس کے بعد اس کو کفن پہنا کر چارپائی پر لائے اور نماز پڑھ کر دفن کیا، اس قسم کے واقعات سے مولانا کی زندگی بھرپور ہے۔

احترام اکابر حضرت مولانا کی زندگی میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے اور یہ جذبہ فداکاری وجاں نثاری کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ مولانا ریل میں تشریف لا رہے تھے، مشرقی پنجاب کے ایک اسٹیشن پر جب ٹرین پہونچی تو ایک مخالف مجمع نے جس کا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام رح پر سنگباری شروع کر دی، مولانا نے حضرت شیخ کو آڑ میں لے کر خود کو بلا تامل مجمع کے سامنے پیش کر دیا، اور اب مولانا پر براہِ راست پتھر برسنے لگے حتیٰ کہ ایک پتھر نازک موقع پر آکر لگا، فرماتے تھے کہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ جب تک حفظ الرحمٰن کے بدن میں جان موجود ہے حضرت شیخ پر آنچ نہ آنے دے گا۔

اسی سنگباری کے سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے جو مجھ سے حضرت اقدس مولانا رائے پوری دامت برکاتہم نے بیان فرمایا کہ پاکستان میں کسی مقام پر ایک شخص ان کو ملا اور بے اختیار رونے لگا، دریافت کرنے پر اس نے یہ داستان سنائی کہ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہے۔ اور جس مجمع نے حضرت شیخ پر سنگباری کی تھی بدبختی سے یہ بھی اس میں موجود تھا۔

اس نے بتلایا کہ اس مظاہرہ کے موقع پر اپنی تشفی غیظ کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ برہنہ ہو کر حضرت شیخ کے سامنے ناچنے لگا۔ واقعہ رفت وگذشت ہوگیا، لیکن لا ربی ولا ینسیٰ کچھ عرصہ بعد جب پنجاب میں ہولناک فسادات ہوئے۔ تو سکھوں نے اس کے ساتھ یہ طریقہ برتا کہ اس کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا اور گھر کی بہو بیٹیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ برہنہ ہو کر اس کے اور مجمع کے سامنے ناچیں، وہ کہتا ہے کہ اس وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ آج کا یہ ناچ اُس برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام ہے جو حضرت شیخ الاسلام رح کی اہانت کی غرض سے میں نے کیا تھا۔

حضرت مولانا پیکرِ وفا اور مجسمۂ شرافت وانسانیت تھے، انتقام سے آپ کا قلب قطعاً ناآشنا تھا، میری نگاہ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ تحریکات کے زمانۂ شباب میں لوگوں نے مولانا کو اذیتیں پہونچائیں اور توہین وتذلیل کے طریقے اختیار کیے، لیکن آزادئ ہند کے بعد انھیں اشخاص نے اپنی ضرورتوں میں مولانا سے امداد طلب کی اور بلا دریغ بغیر کسی ادنیٰ تامل کے، مولانا نے ان کی مدد کی۔ اور حرف شکایت کا زبان پر لانا تو درکنار کبھی پیشانی کی چتونوں سے بھی اس شکایت کی یاد تازہ نہ ہونے دی۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے ہمیشہ ان کے ساتھ پیش آتے رہے۔ حتیٰ کہ مولانا کے ان اخلاقِ کریمانہ سے متأثر ہو کر وہ لوگ مولانا کے گرویدہ اور شیفتہ بن گئے۔

حضرت مولانا نہایت جری انسان تھے اور اعتماد علی اللہ سے ان کا قلب معمور تھا، آزادئ ہند کے بعد بگڑے ہوئے حالات میں یہاں کے مسلمانوں کو بھی وہ جرأت وخودداری اور اعتماد علی اللہ کا درس دیا کرتے تھے اور بھارت کے مسلمانوں کی مشکلات کا ان کے نزدیک یہی واحد علاج تھا۔

۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے ہنگاموں میں حضرت مولانا رح نے جرأت واستقامت کا جو اعلیٰ کردار پیش کیا ہے۔ وہ ان کی سوانح حیات کا نہایت روشن باب ہے، اور مسلمانانِ ہندوستان اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں سے متعلق ایک مرتبہ میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ دہلی میں گولیوں کی بوچھار اور تلواروں کی جھنکار میں سے آپ کس طرح گذر جایا کرتے تھے، اس سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا، اس سے ان کی انتہائی حوصلہ مندی اور اعتماد علی اللہ کا اظہار ہوتا ہے، اسی سلسلے میں یہ بھی فرمایا کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ نے مجھکو (سورۂ اخلاص کا) ایک خاص عمل تلقین فرمایا تھا۔ اس دور میں وہ عمل میرے ورد میں رہتا تھا۔

مجاہد ملت حضرت مولانا رح پرانے بزرگوں کی مانند وضع داری میں بہت پختہ تھے، جس کسی جگہ ایک دفعہ بھی تعلق...... پیدا ہوگیا تو ہمیشہ اس کو نبھایا۔ اس ذیل کا ایک واقعہ یہ ہے کہ تقریبًا تیس سال سے بھی زائد عرصہ تک حضرت مولانا کا یہ معمول رہا کہ دن کی ٹرین سے جب بھی سیوہارہ تشریف لاتے تو اسٹیشن سے اول برادر محترم حاجی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے پاس رونق افروز ہوتے۔ بھائی صاحب مرحوم مولانا کے مخصوص ترین دوست اور بقول حضرت مولانا کے جگری دوست تھے۔ پھر صبح نو بجے سے دوپہر تک اور عصر سے تقریبًا عشار تک تقریبًا روزانہ غریب خانہ ہی پر وقت گذارتے تھے اور یہی معمول بھائی صاحب کی وفات کے بعد رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی اس معمول میں تخلف ہوا ہو۔

حضرت مولانا کی یاد میں بے شمار انسان مضطرب و بے قرار ہیں اور ان کے اعزہ واحباب نیز متعارفین کی لاتناہی تعداد ان کے لیۓ آج غمگسار ہے۔ ان متعارفین میں بادشاہ اور امراء اور وزراء بھی ہیں اور علماء و فقراء بھی ہیں اور عام پبلک بھی، لیکن سب سے زیادہ مضطرب مظلومین کا وہ طبقہ ہے جن کے لیۓ حضرت مولانا پشت پناہ تھے ان میں وہ بے بس و بےکس اور لاوارث بازیافتہ مسلمان خواتین بھی ہیں، جو حضرت مولانا کو اپنا باپ سمجھتی تھیں اور جیسا کہ مجھکو معلوم ہے حضرت مولانا فی الحقیقت ان کے لیۓ ہرطرح مثل باپ کے ہی تھے۔ ان بے بسوں اور بے کسوں کے غم واضطراب کا بجز ان کے اور کون اندازہ کرسکتا ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی کا آغاز تقریبًا ۳۸ ہجری سے تحریک خلافت میں شمول سے ہوا ہے۔ اس کے بعد جب جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی تو حضرت مولانا ہمیشہ کے لیۓ اس سے وابستہ ہوگۓ اور جمعیۃ کے راستے سے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے منسلک ہوۓ اور افق ہند پر آفتاب بن کر چمکے، اس پورے دَور کی تاریخ ارتقاء امید ہے کہ ان کے رفقاء کار بیان فرمائیں گے۔

حضرت مولانا رح کی علمی اور تصنیفی خدمات کا آغاز پیارم پیٹ مدراس سے ہوتا ہے۔ غالبًا "**حفظ الرحمٰن لمذاھب النعمان**" حضرت مولانا کی سب سے پہلی جلیل القدر تصنیف ہے، جس میں دلائل وبراہین کے ساتھ حضرت مولانا نے ان الزامات کا دفاع کیا ہے جو حنفیت پر مخالفین کی جانب سے کیۓ گۓ ہیں۔

"غمگسار قوم" (بقیہ صفحہ ۱۳۶)

کو دیکھ کر بھی کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مولانا اصل مرض سے نجات پا چکے ہیں، لیکن یہ اندازہ بھی بالکل نہیں تھا کہ ان کا وقت اتنا کم باقی رہ گیا ہے، میں مولانا سے وعدہ کرکے آیا تھا کہ اس وقت تو آنے والوں کا سخت ہجوم ہے۔ اب انشاء اللہ میں چند روز کے بعد پھر آؤں گا۔ اس درمیان میں یہ اطلاع ملتی رہی کہ اگرچہ ٹمپریچر تو بدستور ہے لیکن کمزوری آہستہ آہستہ گھٹ رہی ہے اور قوت کچھ بڑھ رہی ہے۔ اگست کے پہلے ہفتہ میں میں نے دہلی جانے کا پروگرام بنالیا تھا کہ بالکل اچانک دو اگست کی صبح کو مولانا کے انتقال کی خبر سن لی۔

اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کی حکمتیں خود ہی خوب جانتا ہے۔ ہم بندوں کو چارۂ دم زدن نہیں۔ لیکن ہم کم نگاہوں نے تو یہی محسوس کیا کہ وہ ایسے وقت پر اٹھائے گئے جب کہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے لیے بظاہر اُن کی بڑی ضرورت تھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ کسی موت ہی سے حیات کا سامان پیدا کرے۔ "یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی" اس کی شان ہے۔

اپنا ایک خواب

جی چاہتا ہے کہ اس تذکرہ کو اپنے ایک خواب پر ختم کروں۔ غالباً پانچویں اگست کو میں نے اس سلسلہ کی وہ پہلی قسط املاءً لکھائی جو ۱۰ اگست کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔ پانچ اور چھ اگست کی درمیانی شب میں میں نے خواب دیکھا کہ مولانا کے متعلق کوئی بہت تشویش انگیز خبر آئی ہے غالباً یہ کہ اُن کی حالت نہایت نازک ہے، میں اس خبر کے ملتے ہی دہلی روانہ ہوگیا۔ مولانا کا قیام ایک بہت وسیع کوٹھی میں ہے مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں لوگوں کا کوئی ازدحام نہیں ہے جو غیر معمولی حالت میں ہونا چاہیئے۔ تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہیں۔ میں اندر چلا گیا دیکھا کہ مولانا نہایت تندرست بیٹھے ہوئے ہیں، جسم پُر گوشت ہے۔ رنگ سرخ و سفید ہے، ڈاڑھی سیاہ اور چمکدار ہے (حالانکہ مولانا جوانی میں بھی کبھی ایسے نہیں تھے) میں نے اُنھیں اس حالت میں دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے بلکہ خفا ہو کر کہا کہ "آپ اچھے خاصے بیٹھے ہیں اور اپنے سارے دوستوں کو آپ نے پریشان کردیا۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کے متعلق اس خبر کی اشاعت نے دنیا کو کس قدر پریشان کیا ہے۔"

مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ "میں اچھا نہیں ہوں تمہیں ایسا نظر آرہا ہوں۔"

اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوتی رہیں پھر فرمایا کہ:-

"میری کتاب "ولایت"، تو تمہارے پاس ہوگی؟"

مجھے خواب ہی میں یاد آیا کہ مولانا نے اکابر اولیاء اللہ میں سے کسی بزرگ کی کتاب کا اُردو میں ترجمہ یا اُس کی تلخیص کی تھی اور "ولایت" ہی کے نام سے اب سے بہت پہلے وہ چھپ بھی گئی تھی۔ اسی بناء پر میں نے مولانا سے کہا کہ یاد تو آیا بہت دن ہوئے آپ کی وہ کتاب دیکھی تھی اب پتہ نہیں کہ میرے

پاس ہے یا نہیں ؟"
مولانا نے فرمایا کہ اب اس کا نیا اڈیشن تیار ہوا ہے۔ اور یہ کہکر اُس کا ایک نسخہ مجھے دیا۔ یہ جیبی سائز کی بہت ہی حسین کتاب تھی، ٹائیٹل پر نہایت خوشخط، اس کتاب کا نام "ولایت" لکھا ہوا تھا اور نیچے مولانا کا نام تھا۔ مجھے خواب میں مولانا کو صحت مند دیکھکر اور اُن کی یہ کتاب پاکر اتنی خوشی ہوئی کہ فرطِ مسرت ہی سے آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی میں نے اپنے کو مسرت وخوشی سے لبریز پایا۔ گھڑی دیکھی تو تین بجے تھے اُٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی مولانا کے لیے خصوصیت سے دُعا کی۔ اتنے میں فجر کی اذان ہوگئی اس کے بعد میں پھر لیٹ گیا، میری آنکھیں بند تھیں اور میں ایسی حالت میں تھا کہ نہ وہ پوری بیداری کی حالت کہی جا سکتی ہے اور نہ نیند کی، اسی حالت میں میں نے دیکھا کہ نہایت حسین اور نورانی حروف میں لکھی ہوئی قرآن مجید کی یہ آیت میری نظر کے سامنے ہے۔

"ھوالذی یقبل التوبۃ عن عبادہ ویعفو عن السیئات"

یہ خواب ظاہر ہے کہ تعبیر سے مستغنی ہے۔ امید ہے کہ مولانا نے ملت کے لیے جو کچھ کیا اور اللہ کے لاکھوں بندوں نے اُن کی علالت کے زمانہ میں اُن کی صحت وبحالی کے لیے جو دعائیں کیں جو یقیناً آخرت کے لیے ذخیرہ بنتی رہیں، انشاء اللہ ان سب کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ اُن کے ساتھ خاص الخاص رحمت وکرم کا ہوگا، وہ رؤف بالعباد اور ارحم الراحمین ہے۔

تقریرِ سیرت

از
مولانا حفظ الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذُ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضلّ لہ ومن یضللہُ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الّا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبدہٗ ورسولہ۔

امّا بعد۔

صدرِ محترم! بزرگو اور دوستو!

سیرتِ پاک کے اس مقدس اجتماع میں آپ نے مجھے دو بار موقع دیا ہے، دو سال پہلے بھی میں آپ کی خدمت میں آچکا ہوں شاید آپ کو یاد ہو، میں نے کہا تھا کہ سیرتِ پاک بیان کرنیکے دو طریقے ہیں عقلی اور ایمانی ذکرِ پاک سے نورِ ایمانی کو رونق بخشنے کا مقصد ایک بابرکت مقصد ہے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ نے اس اجتماع کو مسجد میں نہیں بلکہ میدان میں کیا ہے؛ جیسے منڈی کی اس سڑک پر آپ دیکھ رہے ہیں آپ نے ہر شخص کو دعوتِ عام دی ہوگی۔ اس میں مسلمان ہوں گے، اور غیر مسلم بھی۔

سوال یہ ہے کہ اگر میں صرف رسولِ پاکؐ کی عقیدت کا ذکر کروں تو غیر مسلم کیا فائدہ حاصل کرسکیں گے۔ ضرورت ہے کہ حسنِ عقیدت کے ذریعہ نہیں بلکہ عقلی حیثیت سے سیرتِ پاک کو پیش کروں۔ عقل کے ذریعہ دنیا کو سمجھاؤں تاکہ تمام دنیا کے لیۓ یکساں فائدہ بخش ہو۔

رسولِ اکرمؐ نے جس کتابِ الٰہی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس کے صفحۂ اول پر پہلا جملہ الحمد للہ رب العٰلمین پکار کر آواز دیتا ہے کہ اے دنیا کے لوگو! سب تعریفیں اس خدا کے لیۓ ہیں جو تمام عالم کا رب ہے۔ وہ تنہا مسلمانوں یا کسی قوم کا رب نہیں ہے بلکہ اس کی ربوبیت ہمہ گیر اور غیر محدود ہے اس کے دائرۂ ربوبیت سے کوئی باہر نہیں ہے، اس کتابِ الٰہی کا یہ بھی اعلان ہے کہ رسولِ پاک کی ذات رحمت للعالمین ہے اُس کی رحمت کا دائرہ بھی تمام عالمِ انسانیت کو محیط ہے۔

اس بناء پر مجھے کہنے کا موقع دیجیۓ کہ اس انداز سے رسولِ پاکؐ کی سیرتِ مبارکہ کو پیش کروں تاکہ غیر مسلم بھی رحمتِ عالم کی سچائی کا اعتراف کیۓ بغیر نہ رہ سکے۔ رسولِ کریمؐ نے دنیا کے اندر جو انقلاب پیدا کیا اسے نماز اور روزہ ہی میں محصور کر کے نہیں چھوڑا بلکہ حیاتِ انسانی اور دنیاوی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں سبھی میں انقلاب پیدا کیا۔ معاشی اور اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں غیر معمولی انقلاب پیدا نہ کیا ہو۔

رسولِ کریم ؐ نے دنیا کے سامنے اعلان کیا۔ لا إلٰہ إلّا اللّٰہ۔ خدا کے سوا کوئی قابلِ پرستش نہیں اس اعلان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساری دنیا خدا کو ایک ہی مانتی ہے وہ چاہے جس نام سے پکارے، نام مختلف ہیں، ذاتِ واحد ایک ہے۔ میرا تو دعویٰ ہے کہ خدا کے ماننے میں صرف مذہب والے ہی نہیں بلکہ منکرِ خدا بھی خدا کو مانتے ہیں اس بناء پر کہ آپ دیکھیں جب کوئی کہتا ہے کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے، یہ کہنے پر اس کے دل میں ایک کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے۔ ایک دیوار کو دیکھ کر جب کوئی یہ کہتا ہے کہ دیوار اندھی ہے اور دوسرا برخلاف اس کے کہتا ہے کہ اندھی نہیں ہے۔ پہلا ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن دوسرا جب ایک بے حقیقت بات پیش کرتا ہے تو اس کے دل میں کھٹک کا پیدا ہونا لازمی ہے اسی طرح جب کوئی کہتا ہے کہ میں کسی طاقت کو نہیں مانتا تو اس کے دل پر ضرور چوٹ لگتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ∴ بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

درحقیقت انکار کرنے والے کو بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کلمہ کو پیش کر کے انقلاب عظیم رونما کیا وہ کلمہ صرف مسلمانوں کا کلمہ نہیں ہے بلکہ دنیائے انسانیت کے لیئے ایک پیغامِ حیات ہے۔ سارے عالم کو توجہ دلائی کہ اس کلمہ کا تعلق صرف اس بات سے نہیں ہے کہ اسلام یا ایک مذہب کہتا ہے بلکہ بتقاضائے فطرتِ انسانی اُس خدا کی طرف سے پیش ہونے والا کلمہ ہے جس خدا کا قانونِ قدرت دنیا میں مکمل طور پر کار فرما ہے، سب اس کے قانونِ قدرت سے بندھے ہوئے ہیں۔ مادّی اور روحانی دونوں زندگی میں اس کی کارفرمائی ہے۔

دنیا دیکھ سکتی ہے کہ ہر ایک فطرت بلندی سے پستی کی طرف مائل ہے۔ ڈھیلا، مٹی، پتھر، اینٹ، جن کا تعلق مادیات سے ہے کسی بھی قوت کا سہارا لیئے بغیر ایک لمحہ کے لیئے بھی بلندی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ میں صرف ایک ٹھیکری کو اوپر اچھالتا ہوں لیکن وہ اوپر جا کر فوراً نیچے واپس آجائے گی۔ درخت میں لگا ہوا ناریل شاخ سے جب ٹوٹتا ہے تو اسے نیچے ہی آنا پڑتا ہے اوپر نہیں جاتا، جس کے بارے میں ساتویں آٹھویں کلاس کا ایک بچہ تک یہی کہے گا کہ زمین کی کشش کے سبب ایسا ہوتا ہے، لیکن اس جواب سے خدا کے ماننے والوں کو اطمینان نہیں ہوتا، کیونکہ یہ امر جبکہ مسلم ہے جس کی تصدیق سائنس بھی کرتی ہے کہ لاکھوں سیّارے بے شمار سورج اور چاند جو کہ خلا میں موجود ہیں ان میں کافی کشش ہے پھر یہ چیزیں اوپر کیوں نہیں جاتیں؟ اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں ہے بلکہ مذہب جواب دیتا ہے کہ اے انسان دل کی آنکھ سے دیکھ! بلندی صرف خدائے واحد کو حاصل ہے۔ حیوانات وجمادات اور نباتات کی ہر شئے کا مشاہدہ کر، یہ درخت جس کے پھول پتے، اور پھل بلندی پر نظر آتے ہیں ان سب کی زندگی کا دار و مدار صرف اسی جڑ پر ہے جو نیچے ہے ہر پرندے کی جھکی ہوئی خوب صورت چونچ ظاہر کرتی ہے کہ درحقیقت میری فطرت پستی کی طرف مائل ہے، اے انسان تو اپنے نفس کو ٹٹول کر دیکھ، تیرے ہاتھ بھی تو پستی کی طرف جھکے ہوئے ہیں کہ جن کے ذریعہ تو اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے، تو اپنے قلب کو بلندی سے پستی ہی کی طرف لٹکتا ہوا پائے گا، جس کی حرکت پر تیری زندگی کا وجود ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بلندی سے پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اس لیئے کہ یہ ہر ایک کی فطرت ہے اور

کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اپنی فطرت کی خلاف ورزی کی صلاحیت ہو۔

قدرت نے جو انسان کی پیشانی کو بلند بنایا ہے اس میں ایک مصلحت ہے جب آپ انانیت کے جذبے میں آتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں کہ شہنشاہوں کے سامنے بھی میری پیشانی نہیں جھکتی۔ قدرت کا اعلان ہے کہ ساری چیزیں تیری خدمت گزار ہیں وہ سب تیرے لئے ہیں مگر پیشانی صرف خدا کے لئے ہے اسے جو بلندی دی گئی ہے اس لئے نہیں کہ مخلوق کے سامنے جھکے وہ اگر جھکے گی تو صرف خدا کے سامنے ہی جھکے گی۔

لا الٰہ الا اللہ کا یہی وہ تصور ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ہر شخص مانتا ہے کہ چھوٹا ہی بڑے کے سامنے جھکتا ہے، بڑا چھوٹے کے سامنے نہیں جھکتا لیکن انسان مخلوق میں سب سے بڑا ہونے کے باوجود درخت، پتھر، چاند، سورج اور نہ جانے کتنے باطل اور خود ساختہ معبودوں کے سامنے جھکتا ہے۔ اے انسان تو کس قدر گراوٹ پر اتر آیا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ ساری کائنات تیری مٹھی میں ہے تو سائنس کی مدد سے خلا میں چاند میں اور دوسرے سیاروں میں پہونچ سکتا ہے۔ بلکہ سورج پر بھی فتح حاصل کر سکتا ہے، میں نے تیرے ہاتھ میں مخلوق کو مسخر کر رکھا ہے لیکن تو میرے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب کے لوگ خدا کو مانتے تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ جنگ کی دیوی، صلح کا دیوتا، بارش کی دیوی اور رزق کا دیوتا الگ الگ ہے یہ سب مل کر ایک خدا کی قوت بنتے ہیں، رسول اکرمؐ نے آکر بتایا کہ نہیں، صرف ایک خدا ہے اور ساری چیزیں اس کے ید قدرت میں مسخر ہیں وہ ہمہ گیر قوت اور طاقت کا مالک ہے۔ بالآخر رسولؐ نے دنیا کے سامنے جو نقطۂ نظر پیش کیا دنیا کو ماننا پڑا۔

روح اس بات کی خواہشمند ہوئی کہ میرے جسم کو تو غذا اور پھلوں سے طاقت دی جاتی ہے لیکن میں ہوں مجھے معرفت کی غذا چاہیئے۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ متمدن ممالک ہیں، ہندوستان، ایران اور رومۃ الکبریٰ کا طوطی بول رہا ہے۔ ان میں دانش ہے "اپنی غذا کی تلاش انھیں میں چل کر کرنی چاہیئے" اس نے ہندوستان پہونچ کر اپنی غذا طلب کی، ہندوستان نے کہا کہ مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا کیئے بغیر نہ تو ایک خدا کی عبادت کر سکتی ہے اور نہ اس کی معرفت کی غذا حاصل کر سکتی ہے روح نے مونہہ پھیر لیا اور کہا کہ جب ایک غلام دو مالکوں کا بیک وقت فرماں بردار نہیں بن سکتا تو میں ان سینکڑوں کی وفادار کیسے بن سکتی ہوں وہ رومۃ الکبریٰ گئی پاپائے روم نے کہا اے روح تو اپنے صحیح مقصد تک پہونچی ہے لیکن یاد رکھ، پہلے تجھے باپ، بیٹا اور روح القدس ان تینوں پر ایمان لانا ہوگا۔ پھر انھیں میں تجھ سے خدا اور اس کی معرفت کی غذا ملے گی، روح نے انکار کیا اور کہا کہ ایک تین نہیں ہو سکتا، وہ ایران گئی۔ فیثا غورث کے شاگرد زرتشت نے کہا کہ اے روح یاد رکھ یہاں خدا کی دو طاقتیں ہیں نیکی کا خدا یزداں اور بدی کا خدا اہرمن ان کے بغیر تجھے خدا کی معرفت کی غذا نہیں مل سکتی۔ روح کو یہاں سے بھی نا امید ہو جانا پڑا۔ اس نے سوچا کہ جب دنیا کے متمدن ممالک میں جہاں عقل و دانش کے چراغ جل رہے ہیں وہاں ہم کو اپنی غذا نہیں مل سکتی تو اور کہاں ملے گی۔ ایک پہاڑ کی بلندی کی چوٹی پر گئی اور طے کیا کہ گر کر مر جانا چاہیئے گرنا ہی چاہتی تھی کہ ایک کمبل پوش نے جھلستے ہوئے ریت کے تودوں سے نکل کر ایک تپتی ہوئی پہاڑ کی چٹان سے پکار کر کہا کہ اے روح خودکشی نہ کر آ تیری غذا میرے پاس ہے۔ میری سن۔ روح نے کہا کہ متمدن ممالک سے تو خدا کی معرفت کی غذا ملی نہیں یہاں کیا

ملے گی؟. کملی والے نے کہا:- ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احد ہ
قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد
کیونکہ ھو اللہ احد اللہ اکیلا ہے۔ رومتہ
ہندوستان کی دیوی دیوتا کا محتاج میرا خدا نہیں ہے۔ اس لیے کہ لم یلد ولم یولد نہ وہ
الکبریٰ کے باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیث، توحید کے منافی ہے
کسی کا باپ ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔
ایران کے زرتشت نے بھی یزداں اور اہرمن دو متضاد صفات کے حامل اور برابر کی طاقت رکھنے والے
خداؤں کی تھیوری (THEURY) غلط پیش کی۔
ولم یکن لہ کفوًا احد. میرے خدائے واحد کی طاقت کے برابر کوئی خدا نہیں ہے وہ قادر مطلق ہے
یہ نہ دیکھ کہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ یہ دیکھ کہ کیا کہہ رہا ہے۔
روح نے اس کملی والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات کو سنتے ہی اطمینان کا سانس لیا اور پکار اٹھی کہ بیشک
میری غذا تیرے ہی پاس ہے۔

قدرت نے اس ریگستانی پہاڑی اور غیر متمدن ملک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے بھیجا تاکہ
دُنیا یہ نہ کہہ سکے کہ عقل و دانش کے چراغوں سے علم کی روشنی حاصل کر کے ضابطۂ حیاتِ انسانی پیش کیا
ہے۔ خدا کو بیچ میں ڈال کر اعلانِ نبوت جو کیا ہے فرض ہے۔ ساری دُنیا متحیر ہے اور جانتی ہے کہ یہ وہی ہستی
ہے جس نے کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا لیکن پھر بھی دُنیا میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔
رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی جاہل اور اجڈ قوم میں جب یہ اعلان کیا تھا کہ ساری مخلوق صرف
ایک کی ہے تو قوم نے زبردست بغاوت کا مظاہرہ کیا سارا عرب دشمن بن گیا۔
بقول کارلائل کے کہ "جب تک اعلانِ نبوت نہیں کیا تھا۔ سب دوست تھے اور اعلانِ نبوت پر سب
دشمن ہو گئے"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے میدان میں تین باتیں پیش کی تھیں (۱) ایک خدا کی پرستش۔ (۲)
بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی (۳) عفت و عصمت کی حفاظت، لیکن طائف والوں نے زخمی کیا، شکاری کتے
پیچھے لگا دیے۔ گالیاں سنائیں، پتھروں کی بارش ہو رہی ہے مگر زبانِ مبارک سے احد احد کی صدائیں بلند
ہو رہی ہیں۔

مورخ کہتا ہے کہ پتھراؤ کے سبب جب آپؐ بیٹھ گئے تو حضرت زیدؓ ابن حارثہ پروردۂ آغوشِ رحمت و
پروانۂ شمع رسالت اس حالت کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور کہا کہ آپ ان کو جہنم سے جنت میں لانا چاہتے
ہیں۔ اور وہ آپ پر ایسا ظلم ڈھاتے ہیں۔ بد دعا کیجئے کہ یہ سب برباد ہو جائیں۔
ایک پادری کا کہنا ہے کہ ایک چھینے نے یہ بات کہی تو چہرہ بدل گیا اور فرمایا اے زیدؓ تو نے کیا کہا یہ لوگ
مارتے ہیں تو میں بد دعا کروں، مجھے تو اللہ نے رحمتِ عالم بنا کر بھیجا ہے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور فرماتے ہیں اے
میرے پروردگار میری قوم کو ہدایت دے یہ مجھے نہیں جانتے اور نہیں پہچانتے اے میرے خدا تو ان کو سمجھا اور ان کو
ہلاکت میں نہ ڈال ممکن ہے کہ ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی سعید روح بیدار ہو جو تیرا کلام سنے اور قبول کرے

میرے مولا! تیرے ہی پاک چہرہ میں پناہ لیتا ہوں اگر تو میرے ساتھ ہے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں۔

دنیا کہتی تھی، کیا رسول، کیا پیغمبر، ہماری عقل کافی ہے اور ہم رات دن، روشنی اور تاریکی کی پہچان خود کرسکتے ہیں تو نبی کی ضرورت نہیں۔

فطرت کی طرف سے جواب ہوا کہ عقل و دانش مجبور کرے۔ تب تو ماننا ہی ہوگا، آنکھ میں روشنی موجود ہے لیکن بلب گل کردیئے جائیں تو آنکھ کی روشنی جواب دیدے گی۔ انتہائی تاریکی میں جبکہ ایک ہاتھ کو دوسرا نہیں سجھائی دیتا، اگر کوئی کہے کہ آنکھ تو موجود ہے کیوں سجھائی نہیں دیتا، اس کا جواب یہی تو ہوگا کہ قانونِ قدرت کا یہ اصول ہے کہ روشنی ہی سے آنکھ کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مادی زندگی کے لیئے جب یہ اصول ہے تو کیا روحانی زندگی کے لیئے باہر کی روشنی کی ضرورت نہیں ہے؟ ماننا ہوگا کہ نبیؐ کی روشنی کے بغیر یہ زندگی نہیں بن سکتی اور نہ ہی خدا کی سچی معرفت حاصل ہوسکتی ہے۔

انسان کا عجب عالم ہے، گراوٹ پر اُتر آئے تو دُنیا کی ہر چیز کو سجدہ کرنے لگے اور انانیت پر اُتر آئے تو انا ربکم الاعلیٰ کا دعوےٰ کرنے لگے، لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت پیش کی اور جو انقلاب رونما ہوا، وہ انقلاب انسان کو اس کے صحیح مقام پر پہونچاتا تھا۔ تعلیم دی کہ اے انسان نہ اتنا گھٹ کہ ہر چیز کے سامنے سجدہ ریز ہوجائے، اور نہ اتنا بڑھ کر خدا بن جا۔ اے انسان تو ساری دُنیا کا سردار اور تیرا سردار ساری دنیا کا خالق ہے۔ محمّد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر اور بندے ہیں۔ یاد رکھ یہ نہ کہنا کہ رسول کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی نہ کہنا کہ رسول خدا کا بیٹا ہے۔

نبی اور رسول کے لیئے معصوم ہونا ضروری ہے اس لیئے کہ جب دو متضاد چیزیں ہوتی ہیں تو ان میں درمیانی ربط پیدا کرنے والی تیسری چیز کی ضرورت ہے۔ ہڈی اور گوشت دو متضاد چیزیں ہیں ان کے تعلق کو پٹھوں اور رگوں کے بغیر قائم نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح روحانی قانونِ قدرت یہ بھی ہے کہ ایک طرف خدا کی ذات ورار الوریٰ ہے اور دوسری طرف انسان، درمیانی رشتہ کو قائم کرنے کے لیئے کسی واسطے کی ضرورت ہے وہ سبیل یہ ہے کہ ایک انسان تمہاری طرح کا جو کہ تمہارے ساتھ کھاتا، پیتا اور چلتا پھرتا ہو، جس سے کہ تم مانوس ہو لیکن معصوم ہونے کی حیثیت سے امتیازی شان بھی رکھتا ہو، وہی اس ربط کو قائم رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم ہستی خدا اور انسان کے درمیان رشتہ قائم کرنے والی ایک مضبوط کڑی ہے جسے ہم رسول، نبی یا پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دنیا قانونِ قدرت کی اس بات کو تسلیم کیئے بغیر خدا سے کوئی رشتہ قائم نہیں کرسکتی۔

دنیا کی کوئی چیز تین حالتوں سے خالی نہیں ہے۔ (۱) آغاز۔ (۲) بتدریج ترقی کرنا۔ (۳) درجۂ کمال۔ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کا آغاز ہے۔ پرورش پاتا اور بڑھتا رہتا ہے یہ اس کے بتدریج ترقی کرنے کی حالت ہے، جوان ہو جاتا ہے یہ اس کے درجۂ کمال کی حالت ہے۔ بچپنے میں اس کے لباس چھوٹے بنتے ہیں، اس کے بڑھنے کے ساتھ لباس بھی بتدریج بڑے بنتے رہتے ہیں۔ جب جوانی پر پہونچتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ اب تو صاحبزادے کے جسم پر میرے کپڑے بالکل ٹھیک ہوتے ہیں۔ درجۂ کمال تک پہونچنے کے بعد اس کا بڑھنا رک جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بڑھتا ہی رہے اس لیئے کہ یہی قانونِ قدرت ہے۔

تاریکی کو دور کرنے کے لیئے پہلے چراغ وجود میں آیا پھر شمع کافوری اور موم بتیاں ایجاد ہوئیں، گیس آیا۔ آخر

میں بجلی نے آکر اپنی روشنی کا سکّہ ایسا جمایا کہ کوئی نہ ٹھہر سکا، تارے چمکتے ہیں۔ ہلال چاند کی پہلی رات کو نمودار ہوکر بتدریج ترقی کرتے کرتے چودھویں کی شب میں بدر کامل بن کر تمام عالم کو روشن کر دیتا ہے۔ مگر دنیا کہتی ہے کہ ابھی رات ہے ان میں سے کسی نے رات کو ختم کر دینے والا انقلاب پیدا نہیں کیا، لیکن سورج کے نکلتے ہی دنیا بول اُٹھتی ہے۔ انقلاب آگیا، دن نکل آیا، یہ تو مادّی دُنیا کا انقلاب ہے لیکن یاد رہے کہ روحانیت میں بھی یہی قانون قدرت کارفرما ہے۔

انسانوں کی رہ نمائی کے لیئے آدم ؑ کا دیا جگمگایا، نوح ؑ کی شمع کا نوری روشن ہوئی، ابراہیم ؑ، موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ بتدریج ترقی کرتے کرتے بدرِ کامل بن کر چمکے، لیکن انسان کہتا ہے ابھی تو رات ہے یہ کب ختم ہوگی، روحانیت کا آفتاب کب نمودار ہوگا۔

قدرت آواز دیتی ہے دیکھ ذاتِ محمدی ﷺ عالمِ وجود میں آگئی، آفتابِ رسالت نکل آیا، انقلاب رونما ہوگیا۔ اب نہ کہنا کہ رات ہے۔ اس آفتابِ رسالت کے بعد اب کوئی ماہتاب یا آفتاب نہیں ہوسکتا۔ اس لیئے کہ یہی قانونِ قدرت ہے لیکن یاد رکھ کہ آفتاب عالمتاب کی تمازت سے بچنے کے لیئے مئی جون کے مہینوں میں گھر میں چھپ کر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن آفتاب رسالت کو ہم نے سراج منیر بنایا ہے، یہ آفتاب نور ہے، آفتابِ نار نہیں، اس میں کوئی ایسی تمازت نہ ہوگی کہ جس سے تجھے بچنے کی ضرورت ہو۔ اس سے جتنا بھی کسب کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے۔ تین قسم کی غلامی کارفرما تھی (۱) خرید و فروخت کی (۲) ذات و نسل کی اور اقتصادی زندگی کی۔ آپ نے ہندوستان، روم الکبریٰ اور ایران کو دیکھا اعلان کیا کوئی غلام نہیں ہے آقا سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے۔ غلاموں کو برابری کے درجہ پر لانے کے لیئے ہدایت کی کہ جو تم کھاؤ، ان کو کھلاؤ جو تم پہنو وہ انھیں بھی پہناؤ۔ غلامی کو ختم کرنے کے لیئے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو تو غلام آزاد کرو۔ دوسری قسم کی غلامی ذات و نسل کے لحاظ سے تھی، جیسے اونچ اور نیچ کے نام سے ہم آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔ پیشہ ور کو نسلی طور پر ذلیل سمجھتے ہیں وہ چاہے جیسا نیک کام کریں مگر اونچے خاندان میں جو پیدا ہوا ہو حالانکہ بدکاری بھی کرتا ہے لیکن اونچا ہے۔ مگر رسول اکرم ﷺ نے کہا کہ کوئی اونچ نیچ نسلی اعتبار سے نہیں ہے۔ برادریاں صرف جان پہچان کے لیئے ہیں یہ امتیاز گھمنڈ کا اظہار کرنے کے لیئے نہیں ہے اللہ کے نزدیک وہی بندہ اونچا ہے جو پاکباز ہے وہ چاہے جس نسل اور خاندان سے ہو۔ چودہ سو برس گذر گئے آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ریفارمر اس اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لیئے قانون بناتے ہیں۔

گویا اتنے عرصہ کے بعد آج دنیا کو ماننا پڑا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اونچ نیچ کے بارے میں جو بات پیش کی تھی وہ صحیح تھی۔ یورپ میں "چرچ" کے اندر انجیل کی تعلیم اگر کوئی کالا انسان حاصل کرنا چاہے نہیں کر سکتا ہے لیکن مسلمان ہوکر اگر کوئی مہتر بھی مسجد کی اگلی صف میں آکر بیٹھ جاتا ہے تو کسی سید کو بھی یہ مجال نہیں کہ اسے وہاں سے اٹھا سکے۔ آج اس امتیاز کو دور کرنے کے لیئے پارلیمنٹ میں کوئی قانون بنتا ہے تو میں کہوں گا کہ ماننا ہوگا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنھوں نے پہلے ہی فرمادیا تھا کہ:۔

"اے لوگو! گواہ رہو کہ ساری دُنیا کے انسان بھائی بھائی ہیں"

یہ درس ہمارے رسول نے دیا، دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور غلامی کی لعنت سے چھٹکارا دیا۔ ہر زمان میں ہر
دولت مند کو غریب آدمی کو مار ڈالنے کا حق تھا۔ رسول اکرم ؐ نے قیصر روم ہرکلیو (ہرقل اعظم) کو خط لکھا کہ سلام
ہے اس شخص کو ہدایت قبول کرے۔ اے بادشاہ اسلام قبول کرلے تو محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دوگنا
اجر دے گا۔ ورنہ تیری رعایا کا گناہ بھی تیرے ذمے پڑے گا۔

اسی طرح ملک شام میں منذر ابن حارث غسانی۔ ایران کے بادشاہ خسرو پرویز۔ مصر کے والی مقوقس۔ حبش
کے نجاشی اور فرماں روائے بحرین منذر ابن ساوی۔ الغرض بے شمار ممالک کے بادشاہوں تک اپنے خطوط بھیجے
اور جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق تھا انجام دیا تاکہ دُنیا پیغام الٰہی سے آگاہ ہوکر اونچ نیچ کی طبقاتی جنگ
کو ختم کردے۔

عورتوں کی جو حالت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کارلائل کا کہنا ہے کہ بعثت کے قریب یا دریوں میں
بحث تھی کہ عورت انسان ہے کہ نہیں، کئی دن تک تکرار کے بعد انسان تو مانا لیکن یہ فیصلہ کیا کہ مردوں کا
کھلونا ہے۔

ایران میں زرتشت کی تعلیم ختم ہوچکی تھی جب آپؐ کی بعثت ہوئی تو وہاں عورت نہ توکسی کی ماں تھی نہ
کسی کی بیٹی۔ صرف عورت مانی جاتی تھی، گویا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ عرب میں عورت کی کوئی عزت نہ تھی۔ لڑکی
پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کردی جاتی تھی۔

ہندوستان میں عورت کو اپنے مردہ شوہر کے ساتھ خواہ دو دن کی بیاہی کیوں نہ ہو، ستی ہوجانا پڑتا تھا۔ عورت
کی جگہ جگہ ذلّت تھی۔ لیکن رسول اکرم ؐ نے وراثت میں سب کو شریک کیا، مرد کا دوہرا اور عورت کا اکہرا حصہ
اس لیئے رکھا کہ باپ لڑکے کو لکھاتا پڑھاتا ہے تاکہ وہ خوشگوار زندگی گذار سکے، اور میری خدمت بھی کرسکے۔ کوئی
باپ بیٹے کو مصیبت میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتا، بیٹا باپ کی قوتِ بازو ہوتا ہے۔ لڑکا اپنی، اپنے والدین اور
اپنے بیوی بچوں کی کفالت کرتا ہے اس لیئے اس کا دوہرا حصہ رکھا۔ اور لڑکی صرف اپنی ہی کفیل ہے اور شادی کرکے
دوسرے کی کفالت حاصل کرسکتی ہے۔ اس لیئے ازروئے انصاف اس کا اکہرا حصہ رکھا۔

عورت اور مرد میں منصفانہ حقوق قائم کرنے کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ عورت
گھر کی زینت ہے وہ ضرورت پر، پردۂ حیا کے ساتھ باہر بھی نکل سکتی ہے۔ لیکن کلب کی رونق نہیں بن سکتی، اسی
کا نام اعتدال کی راہ اور صراطِ مستقیم ہے۔

پہلے بیوہ کو نکاح کی اجازت نہیں تھی، مرد کو دس گیارہ شادیاں کرنے کا حق ہوتا تھا۔ رسولِ پاکؐ نے فرمایا
یہ فطرتِ انسانی کے بالکل خلاف ہے کہ مرد تو عورت کے مرنے پر شادی کرلے اور عورت مرد کے مرنے پر نہ کرسکے۔
ہر مرتبہ بیوہ ہوجانے پر عورت کو نکاح کرنے کا حق ہے اور مرد بیک وقت اگر انصاف قائم نہیں رکھ سکتا ہے تو چار
کا حق رکھتے ہوئے بھی ایک سے زائد شادی نہیں کرسکتا۔ طلاق کے مسئلہ میں رسولِ اکرم ؐ نے فرمایا۔ اگر آپس میں جھگڑا
ہوجائے تو درگذر سے کام لو، طے نہ ہونے پر عزیز داروں کے فیصلہ کو تسلیم کرو اگر پھر بھی مسئلہ حل ہوتا نظر نہ آئے تو
طلاق دے دو۔ مگر جو کچھ بھی دے چکے ہو واپس نہ لو، بشرطیکہ وہ خوشی سے واپس نہ کردے۔

دُنیا نے طلاق کا مذاق اُڑایا، لیکن سترھویں صدی میں یورپ نے وراثت، اور اٹھارہویں صدی میں طلاق کو

قانونی حیثیت دے کر رسول اکرمؐ کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ آج بیسویں صدی میں ہندوستان بھی "ہندو کوڈبل" پیش کر کے وراثت، اور طلاق کو تسلیم کر چکا ہے۔

رسولِ اکرم ص کے چودہ سو برس پہلے کا دیا ہوا درس آج دنیا کو دہرانا پڑ رہا ہے۔ درحقیقت رسولِ اکرم ص نے منصفانہ انقلاب پیدا کیا۔ دنیا رفتہ رفتہ آپؐ ہی کے بتائے ہوئے راستہ پر آ رہی ہے۔

چاروں طرف بڑی حکومتیں ہیں۔

سرمایہ دار اور غریب دو طبقوں میں تقسیم ہیں۔ سرمایہ دار عیش کر رہا ہے اور غریب نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے سرمایہ دار تجھے اپنی رقم کا چالیسواں اور کاشت کا دسواں حصہ غریب کو بلا کسی جھجک کے دینا پڑے گا اگر کوئی غریب نہیں ملتا ہے تو خلیفہ کے پاس جمع کر دینا ہوگا تاکہ غریب بھی چلتا رہے اور وراثت کے ذریعہ جائداد قائم نہ رہ کر تقسیم ہوتی رہے۔ دنیا اگر یہ تسلیم کر لیتی ہے تو طغیانیٔ جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

رسول اکرم ص نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ پریشان کو قرض اگر دو تو احسان کر کے نہ دو۔ اس کی بیکسی سے فائدہ نہ اٹھاؤ، جو سود کھاتا ہے وہ خدا کو چیلنج کرتا ہے جوئے کو بھی حرام قرار دیا جس کے نتائج سے دُنیا واقف ہے۔

سوشلزم، نیشنلزم کے پیچھے ہم پھر رہے ہیں سمجھتے ہیں کہ کمیونزم کے ذریعہ سماجی زندگی بن سکتی ہے ایسے موقع پر کارل مارکس کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن رسولِ اکرم ص۔ اصحاب کرامؓ اور علی مرتضیٰؓ کا نام نہیں لیا جاتا، دولت سمٹ کر چند کے پاس نہ رہ جائے اس لیے زکوٰۃ کا حکم دیتے ہوئے علی رضؓ نے کہا:-

"وہ حکومت مٹ جانے کے لائق ہے جہاں کے لوگ بھوکے ہوں، دولت مندوں کے ظالمانہ سماج کو مٹانا ہوگا۔

دنیا کے لوگ غلط طریقہ پر طبقاتی جنگ پیدا کرتے ہیں۔ رسول اکرم ص فرماتے ہیں کہ:-

"ہر شخص کو جائز طور پر کمانے کا حق ہے لیکن اس کی کمائی میں دوسروں کا بھی حق ہے"

حضرت عمرؓ نے یہی کر کے دکھایا کہ جن کے زمانہ میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا، اور بیت المال میں جمع کر دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی یہودی کو دروازہ پر سوال کرتے ہوئے دیکھکر حضرت عمرؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تو بھیک کیوں مانگتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ساری عمر کما کر ٹیکس دیتا رہا، اب آنکھ سے کمزور ہو گیا ہوں تو کیا بھیک نہ مانگوں عمرؓ سے اتنا بھی تو نہ ہوا کہ وظیفہ باندھ دیتے۔ آپؓ سن کر آب دیدہ ہوگئے اور اسی وقت سے اس کا وظیفہ باندھ دیا۔

اے مسلمان! تو اپنوں کی نہیں سنتا، رسولِ اکرم ص کی زندگی کو نہیں دیکھتا مگر کارل مارکس کو دیکھ رہا ہے تجھ میں اتنی گراوٹ پیدا ہو گئی ہے کہ آج دُنیا کہتی ہے کہ اسلام اور ہے اور مسلمان اور!

حضرت سلمان فارسی رضؓ رسولِ اکرم ص کے وصال کے بعد ایران چلے جاتے ہیں۔ کچھ ہی دن کے بعد ان کو دیکھ کر سیکڑوں مسلمان ہو جاتے ہیں۔ ایک یہودی حیرت زدہ ہو کر لوگوں سے پوچھتا ہے۔ جواب عام ہے کہ ان کی نظر ہمیشہ نیچی رہتی ہے۔ ایمانداری اور شرافت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ لیکن

آج مسلمانوں نے اپنی زندگی فراموش کردی۔ہم پسماندہ ہیں؟ ذلیل ہیں؟۔

کہتے ہیں کہ طاقت نہیں ہے۔اقتدار بے شک ضروری ہے مگر اسلام کا کہنا ہے کہ حکومت ہی مدارِ عزت نہیں ہے۔کردار کی تعلیم رسولِ اکرمؐ نے دی تھی۔اس کی ضرورت مقدم ہے۔اخلاقِ کریمانہ کے رسولؐ پیکر تھے۔اوراسی کا سبق دیا۔

انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں (۱) راحت اور (۲) دکھ۔آیئے دیکھیں کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے منصب کو پورا کرنے میں کس کو اپنایا۔تاریخ دیکھیے آپؐ باہر نکلتے ہیں تو لوگ گوکھرو بچھا دیتے ہیں جسمِ اطہر پر کوڑا پھینکا جاتا ہے۔نماز پڑھتے ہیں تو گردن پر اونٹ کی اوجھ ڈال دی جاتی ہے۔چادر ڈال کر گلا گھونٹا جاتا ہے۔کمان مار کر چہرہ زخمی کر دیا جاتا ہے۔آپؐ سبھی کچھ برداشت کرتے ہیں۔

جسمِ اطہر پر ایک دن غلاظت کے نہ پھینکے جانے پر دریافت کیا کہ آج کیا بات ہے۔معلوم ہوا کہ غلاظت پھینکنے والی عورت بیمار ہوگئی ہے۔آپؐ اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے ہیں۔پوچھتے ہیں کیسی حالت ہے؟۔یہ تھا آپؐ کا اخلاق۔درحقیقت اخلاق کی طاقت اور کردار کی بلندی وہ تلوار ہے جو دلوں کو فتح کرتی ہے ؎

ترا درد، دردِ تنہا میرا غم غمِ زمانہ ٭ جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

دارالندوہ میں میٹنگ ہوتی ہے۔رسول اکرمؐ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا جاتا ہے کافی بحث ومباحثہ کے بعد ایک نے مجمع میں سے ہاتھ اُٹھایا کہ میں ابھی جاکر محمدؐ کا قصہ پاک کیے دیتا ہوں۔

ابوالحکم ابن ہشام نے کھڑے ہوکر روکا اور کہا کہ قریش کے جو بارہ کی تعداد میں بڑے بڑے قبیلے ہیں، ان میں سے ایک ایک بہادر نوجوان کو تلوار دیکر بھیجدیں۔مکان سے جیسے ہی باہر نکلیں سب ایک ساتھ حملہ کردیں اورختم کردیں۔اس طرح کہ ایک ہی وار سب مل کر کریں۔جس سے یہ ہوگا کہ بنو عبدِ مناف اکیلے سارے قبیلوں سے خون کا بدلہ نہ لے سکیں گے۔بالآخر ان کو دیت دی جائے گی۔

یہ طے کرنے کے بعد سب رسولِ اکرمؐ کے چچا ابوطالب کے پاس گئے۔ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔چچا پریشان ہوگئے۔جب حضورؐ تشریف لائے اور چچا کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر خیریت پوچھی۔چچا نے کہا کہ ہم نے تین برس تک سوشل بائیکاٹ کے وقت مدد کی اور تمہاری پریشانی اور تکلیف میں شریک رہے۔لیکن آج قوم نے ایسا فیصلہ کیا ہے جسے ہم برداشت نہیں کرسکتے اور نہ مقابلہ کرسکتے ہیں۔آپؐ اپنے مشن کو دھیما کردیجیے۔میں آپؐ کی مدد اب نہ کرسکوں گا۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا۔میرے خدا نے کہا ہے کہ جس نے کبھی احسان کیا ہو اس کا شکریہ ادا کرو۔میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر یاد رہے کہ میں نے آپ کی مدد پر یہ کام نہیں کیا ہے۔میرا سہارا خدا پر ہے اسی کے سہارے پر قدم اٹھایا ہے۔میں باز نہیں آسکتا چاہے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لاکر کیوں نہ دکھدیا جائے میں رُک نہیں سکتا، حتیٰ کہ خدائے تعالیٰ میری سچائی کو ان پر ظاہر کردے یا میں اس کوشش میں فنا ہو جاؤں۔

سلمان فارسیؓ اور بلال حبشیؓ غلام ہیں ان کے آقا سے خریداری چاہی جاتی ہے مگر آقا نہیں بیچتا،

ان کو بچے راستوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں لیکن زبان سے احد احد کی تکرار جاری ہے آقا نے ایک دن کہا چھوڑ دے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو، دولت وحشمت سب کچھ دوں گا، ورنہ ایک ایک جوڑ کاٹ کر ماردوں گا۔ مگر جواب دیا جاتا ہے کہ آقا تو نے خریدا ہے جسم تیرا ہے تو اسے کاٹ سکتا ہے لیکن روح نہیں خریدی ہے۔ روح کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ہے تو روح کو نہیں کاٹ سکتا۔

رسولِ اکرم ﷺ کو اپنا محبوب شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر جانا پڑا۔ وہاں پہونچنے پر تین قسم کے مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا۔ (۱) یہود (۲) قریش (۳) مشرکین فتنہ وفساد ظلم وبے انصافی، بدامنی اور بدی کو مٹانے کے لیے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں۔ ایک بار ایسی شرطوں پر بھی معاہدۂ صلح کرلیا جو کھلے طور پر کمزوری کے مترادف تھیں مگر آپ کے ہم وطن ان شرطوں پر بھی قائم نہ رہے اور صلح کے برخلاف رسول اکرم ﷺ کی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ خدا کے پیغمبر کو ان کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ دس ہزار کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی ہوئی ہے۔ ابوسفیان نے صلح کرنی چاہی، آپ نے فرمایا کہ اگر ایک ایک مسلمان کو قتل کر دیتے پھر بھی شاید انتقام نہ لیتا لیکن محمد نے جن کو پناہ دی ان کو قتل کر دیا اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ انصار کی فوج کے علمبردار تھے۔ ابوسفیان کو دیکھ کر کہا آج گھمسان کا دن ہے حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔ ابوسفیان نے رسول اکرم ﷺ کو توجہ دلائی تو جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا اور کہا جاؤ، ابن عبادہ جاؤ۔ کہو آج جنگ کا دن نہیں ہے۔ آج رحمتِ عالم کی رحمت کا دن ہے۔ آج کعبہ میں جنگ نہ ہوگی۔ آج کعبہ کو غلاف چڑھایا جائے گا۔ آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے قلب مبارک اپنے خدا کے فضل واحسان کے بارے جھک گیا یہاں تک کہ سر اقدس اونٹ کے کجاوے سے جا لگا۔ اہل مکہ گرفتار ہو کر سامنے پیش ہوتے ہیں۔ پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟

جواب دیا کہ ہم بہادر ہیں۔ آپ کے ساتھی اگر ہماری گرفت میں آتے تو ہم سب کو قتل کر ڈالتے اور یہی آپ کو بھی حق ہے آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں قتل کروں گا؟ خدا نے تو اتنی بھی اجازت نہیں دی کہ تمہیں ملامت بھی کروں۔ آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم ہر جرم وخطا سے بری ہو۔ مشکیں کھول دی گئیں اور سب آزاد کر دیئے گئے یہ تھی رحمتِ عالم کی شفقتِ لاانتہا۔

مؤرخ کہتا ہے کہ تین دن کے بعد اہل مکہ حاضر ہوئے اور کہا کہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم اسلام لے آئیں۔ ارشاد ہوا کہ تین دن کے بعد کیوں آئے۔ جواب دیا کہ مشکیں کھولنے کے بعد ہی فوراً اسلام لے آتے تو دنیا کہتی مرعوب ہو کر ایسا کیا اور ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ دُنیا کے دکھانے کے لیے تو درگذر نہیں کیا گیا ہے۔ مبادا دھوکا ہی دیا گیا ہو۔ بعد میں پکڑ کر قتل کر دیا جائے گا لیکن آج ہم مطمئن ہو کر آئے ہیں اور خوشی کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو برتری اور مردانگی کا سبق پڑھایا ہے کہ مسلمان اگر بزدل ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ بہادری سے مراد یہ نہیں ہے جیسا کہ انسان کی فطرت ہے کہ دولت ہونے پر پڑوسی کو ستاتا ہے۔ قوت ملے تو زیر دستوں کی مدد کرو۔ مصیبت پڑے تو خدا پر شاکر رہو۔ رسولِ اکرم ﷺ کی

شکر گزاری کا کیا کہنا، ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رض پوچھتیں آپ تو گناہ سے پاک ہیں؟۔

جواب دیا جاتا کیا شکر گذار نہ بنوں۔ سارے عالم کے رہ نما رات بسر کرتے ہیں ایک ایسی تنگ جھونپڑی میں کہ کھڑے ہونے پر چھت سر سے لگتی تھی اور نماز میں سجدہ کرنے پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنے پیر سمٹانے پڑتے ہیں۔ صبح جج کی حیثیت سے قوموں کے فیصلے کرتے ہیں۔ دوپہر کو دوستوں کے بیچ بیٹھتے ہیں۔ شفقت ومحبت کی باتیں کر رہے ہیں لیکن ان میں آپؐ کسی امتیازی مقام پر نہیں بیٹھتے۔ اجنبی کی نگاہیں آپ کو شناخت کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ دھوپ پڑنے پر جب ایک جاں نثار آپؐ پر چادر تان لیتے ہیں تب معلوم ہوتا ہے کہ رحمتِ عالم آپ ہی ہیں۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی سیرتِ پاک سے دنیا پر واضح کردیا کہ اہل وعیال میں بہترین شوہر۔ میدانِ جنگ میں بہترین کمانڈران چیف، عبادت گذاروں میں شب زندہ دار، بہترین جج اور بہترین دوست، بہترین مدبر اور بہترین رہ نما، ہمہ صفات سے متصف، ایسی ہستی کی مثال دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حضرت سلیمان ع اور داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بادشاہی، حضرت موسیٰ ع نے فرعونی طاقت کے سامنے غضبناکی اور مردانگی کا مظاہرہ کیا اور عیسیٰ ع نے نرمی کا (کہ ایک گال پر اگر کوئی طمانچہ مارے تو تم دوسرا بھی پیش کردو) رسولِ اکرم ص نے دونوں چیزیں پیش کیں کہ بدلہ برابر کا لو اگر معاف کردو تو اللہ کے نزدیک سب سے محبوب کام ہے لیکن زیادتی کسی حالت میں نہ کی جائے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ رہبانیت، اور جوگی بننے کی اسلام میں ضرورت نہیں ہے۔ پہاڑ کی کھوہ میں عبادت کرنے والے سے وہ بہتر ہے جو بال بچوں میں رہ کر دنیا داری کے ساتھ خدا کو نہ بھولے۔ انسان کی تخلیق فطرتِ الٰہی پر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتا۔ اسلام نے جماعتی زندگی بخشی ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز۔ ایک ہی مہینہ میں روزوں کی اجتماعی طور پر تکمیل، ایک ہی مہینہ میں فریضۂ زکوٰۃ کی ادائیگی اور اسے اجتماعی طور پر بیت المال میں جمع کرنا۔ ایک ہی وقت میں اجتماعی طور پر حج کی ادائیگی۔ یہ سب اسلام کی بخشی ہوئی اجتماعی زندگی کے مظاہرے ہیں۔ میدانِ عرفات سے گذر جانے پر حج کیوں ہوجاتا ہے؟ ہر ملک کے ہزاروں زبانیں بولنے والے آتے ہیں لیکن وہاں ایک ہی زبان میں نماز پڑھتے ہیں جس سے عالمگیر اجتماعیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

بچپنے میں پڑھتے تھے کہ وحدت میں کثرت، کثرت میں وحدت، آج ماننا پڑتا ہے کہ خدا تو ایک ہے مگر وہ ہیژدہ ہزار عالم کا خالق ہے۔ وحدت میں کثرت بنانے والا ایک ہے کہیں عالمِ حیوانات میں انسان ایسا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نہیں ملتا، اجتماعی زندگی کا نام کثرت میں وحدت ہے۔ اسلام کثرت میں وحدت کا داعی ہے۔

آپ بازار جاتے ہیں میوہ فروش سے سیب ڈو ڈو آنے میں طے کرتے ہیں اور ایک روپیہ میں آٹھ سیب خرید کرلے جاتے ہیں۔ راستے میں دیکھتے ہیں کہ دو سیب داغی ہیں آپ لوٹ پڑتے ہیں۔ میوہ فروش بدل دیتا ہے۔ اس لیے کہ آپ نے ایک ایک سیب کی قیمت طے کرکے خریداری کی ہے ہر سیب اسے اچھا ہی

دینا ہوگا۔

آپ سبزی منڈی میں جاتے ہیں، سیب کی ایک پیٹی کی بولی بول کر لیتے ہیں اور راستے میں دیکھتے ہیں کچھ سیب خراب ہیں واپس ہوکر آڑھتی سے کہتے ہیں کہ اتنے سیب داغی ہیں بدل دو۔ وہ جواب دیتا ہے کہ پیٹی کی قیمت آپ نے لگائی ہے لینا ہو توسب لیجئے، نہ لینا ہو تو سب واپس کردیجئے۔ آپ کو اس کی بات تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

اسی طرح اللہ کے فرشتے اس بات کے لیئے مامور ہیں کہ آدمی جو کام کرے اسے خدا کے سامنے حاضر کرتے رہیں۔ میں نے ظہر کی نماز پڑھی، فرشتے میری نماز اللہ کے پاس لے گئے اس میں داغ دیکھے۔ اللہ نے کہا کہ یہ نماز اس کے منہ پر ماردو۔ میں نے جامع مسجد میں عصر کی نماز ادا کی نماز ایک بھاری جماعت کے ساتھ پڑھی، اخیر تک نماز میں رہا فرشتے پوری جماعت کی نماز کو لے گئے، اللہ پاک نے دیکھا اور کہا دیکھو اچھی اور بُری نمازوں کو چھانٹ دو، فرشتے کہتے ہیں ڈھیری میں توسب ہی شمار ہوتے ہیں قبول کیجئے توسب ورنہ سب واپس کردیجئے۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے سب کی نماز قبول کرلی۔ اس سے مراد ہے کہ جماعتی زندگی بناؤ۔

باب الفتاوی

فتاوی عثمانیہ

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی
(فاضل دیوبند)

سوال گذارش خدمت ہے کہ ایک شخص کی لڑکی تھی جس کی عمر تقریباً سولہ سال کی تھی اس کو ایک نوجوان اپنے گھر لے گیا اور وہاں پر اس کا نکاح اپنے ساتھ کرلیا اس وقت اس لڑکی کا ولی یا وارث موجود نہیں تھا کیوں کہ ان کے ساتھ جس کی لڑکی تھی کوئی رشتہ نہیں تھا۔ بعد میں لڑکی کے والدین کو پتہ لگا تو انہوں نے دعویٰ عدالت میں ظاہر کیا اور لڑکی کو اپنے گھر میں واپس لائے جب لڑکی گھر میں لائی گئی تو لوگ کہنے لگے کہ اس کا نکاح کیا گیا ہے یہ جھگڑا کوئی چار پانچ مہینے تک عدالت میں لگا رہا اس کے بعد جو ملزم تھے انہوں نے قسم کھائی کہ ہمارا اس واقعہ میں کوئی حق نہیں ہے اور کہنے لگے کہ یہ لڑکی ہم کو ایسی ہے جیسی کہ ہماری بہن۔ تقریباً دو سال گزرنے کے بعد والدین گھر میں موجود نہیں تھے تو ایک مولوی صاحب ان کے گھر آئے اور اس نے اس لڑکی کا نکاح خود اپنے ساتھ کرلیا اس کے بارے میں کوئی گواہ نہیں کہ لڑکی کا نکاح ان مولوی صاحب سے ہوا تھا۔ لڑکی اس نکاح کے وقت حاملہ تھی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ خود مولوی تھا اس لیئے اپنا نکاح خود کرلے تو وہ نکاح بھی ہو سکتا ہے۔ دو تین سال گزرنے کے بعد شریعت کرنے والوں نے کہا یہ نکاح نا درست ہے اور جو اس کا پہلے کا نکاح ہے وہ درست ہے۔ یہ واقعات ہوچکے ہیں اب مہربانی فرماکر اس کی تشریح کرکے جواب دیں اور یہ بھی لکھ کر ارسال فرمائیں کہ اس نے جو پہلے لڑکی کا نکاح کیا ہے وہ بھی نا درست ہے یا درست۔ اگر مولوی کا نکاح درست ہو تو پہلے کا نکاح نا درست ہوتا ہے لوگوں کے کہنے کے مطابق کیونکہ یہ ان کا قاضی تھا اور امام بھی یہی تھا جنازہ کی نماز بھی یہی پڑھاتا تھا۔ یہ واردات ہوئی ہے براہِ کرم جواب جلد ارسال فرماکر شکر گذار فرمائیں۔

نیروز الدین کشتواڑ۔

الجواب لڑکی کا جو نکاح پہلے ہوا تھا وہ صحیح ہے اور قائم ہے جب تک کہ شوہر طلاق نہ دیدے اور عدت ختم نہ ہو لڑکی کا دوسرے مرد سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ جس مولوی نے بعد میں منکوحہ لڑکی سے بغیر گواہوں کے نکاح کیا ہے یہ نکاح باطل ہے اور یہ نام نہاد مولوی فاسق زانی اور بدکار ہے لہٰذا مولوی کہنا بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ مولوی کبھی ایسا نہیں کرسکتا۔

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اہل سنت والجماعت ان مسائل کے بارے میں (۱) ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام۔ فتاویٰ رشیدیہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کا حوالہ دے کر دارالحرب کہا ہے اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ لکھتے ہیں کہ بندہ

اس میں فیصلہ نہیں کرتا، یعنی یہ مسئلہ اس لیۓ طلب کیا جارہا ہے کہ بعداز جمعہ کتنی سنتیں پڑھی جائیں ۔ اسی فتاوے رشیدیہ میں یوں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک چار سنتیں ہیں اور امام ابو یوسف رح کے نزدیک چھ ہیں جس پر عمل کرے درست ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک حنفی چھے کیوں پڑھے ۔ صحیح چھ ہیں یا چار ۔ بعض لوگ دو ہی پڑھتے ہیں وہ کس کے نزدیک ہیں۔

(۲) یہ کتاب "فتاوی رشیدیہ"، جوکہ مولانا رشید احمد قدس سرہ کے فتاوی کا مجموعہ ہے قابلِ عمل اور معتبر ہے یا نہیں۔

(۳) اسی میں لکھا ہے کہ خطبۂ عیدین یا جمعہ میں اشعارِ اُردو یا پنجابی یا ہندی حتّٰی کہ اشعارِ عربی پڑھنا مکروہ ہے زید کہتا ہے کہ بھائی یہ مصلحتِ وقت ہے ہمارے لوگ عربی نہیں سمجھتے لہذا پنجابی یا اُردو کے اشعار دورانِ خطبہ جائز ہیں۔صحیح بات کی تحقیق مطلوب ہے

(۴) جو نہایت غور طلب اور ضروری مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ کیا جمعہ کو یا کسی اور دن مسجد میں نمازیوں کے رو برو منبر رکھ کر اور اس پر قرآن مجید رکھ کر کرسی پر بیٹھ کر قرآنِ پاک کا ترجمہ سنانا جائز نہیں۔ یعنی زید کہتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ دستور نہیں تھا ۔ لہذا یہ بدعت ہوئی۔ میز کرسی کا مسجد میں داخل کرنا گیا بالکل ہی منع ہے ۔ نمازیوں میں سے بہت سے کہتے ہیں کہ اس میں ہماری کسرِ شان ہے حالانکہ واعظ منبر پر کھڑا ہوگا تو بھی نمازیوں سے اونچا ہوگا اس میں قرآنِ پاک کی توقیر مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ اچھا اگر میز کرسی کا دستور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تھا تو کیا بجلی کے قمقمے ہی ضیا افشاں تھے یا بجلی کے پنکھے ہی گھوں گھوں کی آواز سے کان کھاتے تھے یعنی یہ چیزیں بھی تو مباح ہیں ۔ از راہِ کرم اس کا جواب دیں۔

(۵) "العشق نار یحرّق ما سوا اللہ" کا کیا یہی مطلب نہیں کہ عشق ایسی آگ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے سوا سب کائنات کو بھسم کر دیتی ہے ۔کیا یہ قرآن پاک کی آیت ہے یا حدیث یا اور کسی کا قول ہے ۔

احمد الدین شرر عاصی رحمت گڈھ مالیر کوٹلہ ۔

الجواب

(۱) نمازِ جمعہ کے بعد امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک چار سنتیں اور امام ابو یوسف رح کے نزدیک چھ سنتیں ہیں ایک سلام کے ساتھ چار اور دو ایک سلام سے پڑھی جائیں گی۔ سنتوں کے بارے میں اگر اختلاف ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ حدیث شریف میں ایسے اختلاف کو رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) فتاوی رشیدیہ قابلِ عمل اور معتبر ہے ۔

(۳) جمعہ کے خطبہ میں کسی قسم کے اشعار پڑھنا مکروہ اور بدعت ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضؓ کے زمانے میں بھی عجمی تھے جو عربی زبان سے واقف نہ تھے مگر آں حضرت ﷺ اور صحابہ رضؓ نے ان کی وجہ سے اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدلا اور ہمیشہ جمعہ کا خطبہ عربی زبان ہی میں پڑھتے رہے ۔ اس بنا پر جمعہ کا خطبہ عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں پڑھنا مکروہ تحریمی اور بدعت ہے ۔ زید کا قول صحیح نہیں ہے ۔

(۴) اس کے اندر کوئی حرج نہیں اگرچہ واعظ کو منبر پر بیٹھکر وعظ کہنا اور ترجمہ بیان کرنا افضل ہے۔

(۵) یہ جملہ کسی کا قول ہے نہ آیت نہ حدیث ۔

سوال سید امیر شاہ اور سید گوجر نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں چند آدمیوں کے سامنے نہایت گستاخانہ الفاظ زبان سے کہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو شیطان اور کتا کہا (نعوذ باللہ) اور یہ ساتھ ہی اہل سنت والجماعت ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں نیز کہتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام پر کسی مسلمان نے اسی لیے نام نہیں رکھا کہ ان میں برائیاں موجود تھیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسلمان سمجھنے والا آدمی کافر ہے۔ شریعت میں ان کے لیے کیا حکم ہے؟۔ عبدالحمید سری نگر

الجواب ان دونوں کا یہ کلام بلا شک وشبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی توہین اور سب وشتم میں داخل ہے۔ یہ لوگ گنہگار فاسق اور اہل سنت والجماعت سے خارج ہیں جس وقت تک اپنے اس خیال سے توبہ نہ کرلیں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان سے اپنے تمام معاملات منقطع کرلیں۔ اہل سنت والجماعت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر خیر کے ساتھ کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی صحابی رضی اللہ عنہ کو برا کہنے کے متعلق سخت وعیدیں ذکر فرمائی ہیں چہ جائیکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی گستاخانہ لفظ زبان سے نکالا جائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شان میں ارشاد فرمایا اللھم علمہ العلم واجعلہ ھادیًا مھدیًا (ترمذی) صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں ادنیٰ سے ادنیٰ گستاخی کرنے والے کے لیے ارشاد رسول ہے ومن اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ تعالیٰ یوشک ان یاخذہ۔(ترمذی)

سوال ایک شادی شدہ لڑکی کو برادری کی پنچایت نے آزاد کر دیا لیکن جس لڑکے سے نکاح ہوا تھا اس نے طلاق نہیں دی جس وقت برادری نے طلاق نامہ لکھنے کا ارادہ کیا لڑکا موقع پاکر بھاگ گیا۔ پہلے لڑکا طلاق لکھنے کو تیار تھا ایسی صورت میں نکاح ثانی جائز ہے یا نہیں؟۔ عبدالصمد علی گڈھ

الجواب جب تک کوئی شرعی وجہ تفریق کی نہ پائی جائے اس وقت تک پنچایت کسی کی عورت کو آزاد نہیں کرسکتی شریعت نے زبانی یا تحریری طور پر طلاق دینے کا اعتبار کیا ہے اور ان دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہوجاتی ہے لیکن جب شوہر (لڑکے) نے نہ زبان سے طلاق کے الفاظ کہے اور نہ لکھکر دیئے اور لکھے ہوئے کی تصدیق بھی نہ کی تو اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوئی۔ لڑکی اسی کے نکاح میں ہے اس لیے نکاح ثانی بھی درست نہیں فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے

سوال آیا خادمہ سے بیوی کے تعلقات قائم کیے جاسکتے ہیں یا نہیں خواہ انسان شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، جہاں تک میری ناپائدار معلومات کا سوال ہے یہ معلوم ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے لیکن غالبًا اس کے ساتھ ضروری شرائط ہوں گی مقامی طور پر بھی معلومات کی گئیں مگر دو مختلف پہلو سامنے آتے ہیں صحیح فیصلہ نہیں ہوتا امید ہے کہ آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے مستفید فرمائیں گے؟
راغب علی کرمانی علی گڈھ۔

الجواب باندی کا حکم شریعت میں یہ ہے کہ باندی کا مالک بلا نکاح اس سے صحبت کرسکتا ہے یہ حکم

قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ مگر کافروں سے جنگ کرنے کے بعد ان کی جو عورتیں مسلمانوں کے ہاتھ لگتی ہیں وہی درحقیقت باندیاں ہیں۔ موجودہ دور میں کیونکہ یہ شرط نہیں پائی جاتی اس لیئے اس قسم کی کسی بھی عورت سے بلا نکاح صحبت کرنا زنا ہے۔

سُوال معلوم ہو کہ کس کس شخص کے یہاں کھانا جائز ہے چونکہ ہم لوگ پریشان ہیں۔ جو شخص گداگری کرتا یا زکاۃ لیتا ہے اور وہ کسی خوشی میں اہل اسلام کو دعوت دے کر کھانا کھلاتا ہے مثلاً عقیقہ اور شادی وغیرہ میں دعوت دے کر کھانا کھلاتا ہو تو اس کے یہاں کھانا جائز ہے یا نہیں؟ عبداللہ حیدرآبادی

الجواب جو شخص گداگری کرتا یا زکاۃ لیتا ہے اگر وہ واقعی غریب ہے تو اس کے لیئے زکاۃ وغیرہ کا لینا جائز ہے اور کیونکہ وہ اس کا مالک ہوجاتا ہے اور مالک ہونے کے بعد وہ پیسہ زکاۃ کا نہیں رہتا اس لیئے یہ شخص کسی تقریب مثلاً عقیقہ کے سلسلہ میں دعوت کرے تو دعوت کھانا جائز ہے لاینبغی التخلف عن اجابۃ الدعوۃ العامۃ کدعوۃ العرس والختان و نحوھما واذا اجاب فقد فعل ما علیہ اکل اولم یاکل والافضل ان یاکل (عالمگیری جلد خامس)

سُوال ہمارے یہاں دو مسجدیں ہیں ایک بڑی اور ایک چھوٹی۔ بڑی مسجد آبادی سے باہر اور چھوٹی مسجد آبادی کے اندر ہے۔ سوال یہ ہے کہ جمعہ دونوں مسجدوں میں ہوتا ہے زیادہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ چھوٹی مسجد میں بھی جمعہ ہوتا رہے۔ مہربانی فرماکر تحریر فرمایئے کہ جمعہ دونوں مسجدوں میں جائز ہے یا نہیں۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ جمعہ صرف بڑی مسجد میں ہی ہونا چاہیئے۔ کیا یہ درست ہے؟ امین الحق مدراسی

الجواب جمعہ کے تقرر کا منشاء یہ ہے کہ سب مسلمان آٹھویں روز باہم مل کر ایک ہی جگہ عبادت میں مشغول ہوں اس لیئے بہتر اور افضل یہی ہے کہ شہر کے تمام مسلمان ایک مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں بشرطیکہ کوئی حرج اور تنگی واقع نہ ہو۔ لیکن اگر ایک مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی دشوار ہو تو حنفی مذہب کے مطابق متعدد جگہ جمعہ درست ہے۔ اس لیئے نماز جمعہ دونوں مسجدوں میں جائز ہے ویتأدی فی مصر واحد بمواضع کثیرۃ مطلقاً (ای سواء کان المصر کبیرًا اولا۔ شامی)۔

از
مولانا محمد منظور نعمانی صاحب

وہ مولانا حفظ الرحمٰن ہی تھے جنہوں نے گاندھی جی کو پہلی بار دہلی میں، مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی الم ناک داستان سنائی۔ مولانا کی ڈاڑھی پر آنسو اور زبان سے مسلمانوں کی ظلم کی داستان سن کر گاندھی جی نے مرن برت کا اعلان کیا۔ وہ اپنے حال سے بے خبر، پھیپھڑے میں کینسر اور سیروں پانی لیئے ہوئے ملت کے کاموں میں دوڑ رہے تھے۔ نہ آرام کا خیال تھا۔ نہ ڈاکٹروں کو دکھانے کی فرصت۔ اللہ تعالیٰ میرے اس مخلص اور محترم دوست، اور اپنے مجاھد بندے کی تربت پر رحمتوں کی بارش فرمائے۔ آمین۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو پہلی دفعہ میں نے اب سے قریباً ۳۸ - ۳۹ سال قبل جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ مرادآباد میں دیکھا، میں اس وقت اپنے وطن سنبھل ضلع مرادآباد میں معقولات کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور حدیث پڑھنے کے لیئے آئندہ سال دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ تھا، یہ آخر ۱۹۲۴ء یا شروع ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ مولانا حفظ الرحمان صاحب اس وقت بالکل نوجوان تھے، میری عمر اس وقت ۱۸ - ۱۹ سال کی تھی اور مولانا ۲۴ - ۲۵ سال کے ہوں گے، وہ عمر میں مجھ سے ۵ - ۶ سال بڑے تھے۔ اس اجلاس میں مولانا نے اپنا ایک عربی قصیدہ بھی سُنایا تھا۔ اُسی وقت کسی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے بہت ممتاز طالب علم ہیں۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتے ہیں اور عربی میں شعر بھی کہتے ہیں (عربی کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میری دلچسپی اس وقت انھیں باتوں سے زیادہ ہوسکتی تھی) اس اجلاس میں میں نے ان کی تقریر نہیں سُنی، نہ ملاقات کی نوبت آئی۔

دارالعلوم دیوبند میں

اگلے سال میں دارالعلوم دیوبند پہونچا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو کہنے کو دارالعلوم کے نائب مہتمم تھے لیکن عملاً در اصل وہی مہتمم تھے۔ اللہ نے انھیں بڑی نگاہ دی تھی، ان کا طریقہ تھا کہ طلبہ میں سے جس میں خاص جوہر دیکھتے اس کو دارالعلوم میں لے لیتے، اس کے لیئے انہوں نے "معین المدرسین،، کا ایک درجہ قائم کر رکھا تھا، ابتدائی تقرر ایسے نو فارغین کا اسی حیثیت سے ہوتا تھا، جب میں دارالعلوم دیوبند پہونچا ہوں تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب غالباً معین مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم

مشرب دیوبند، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶۲ء

کے استاد مقرر ہو چکے تھے اور چند ابتدائی و متوسط اسباق ان سے متعلق تھے، میری عادت چونکہ ملنے ملانے کی بہت کم تھی اس لیئے اس زمانہ میں مولانا سے میرا کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا بہت اچھے مناظر بھی تھے اسی زمانہ میں ایک معرکہ کا مناظرہ شاہجہاں پور میں قادیانیوں سے ہوا تھا اُس میں ختم نبوت کے موضوع پر مولانا ہی نے مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ کیا تھا، قادیانیت سے متعلق ابتدائی دور میں مولانا نے کچھ پمفلٹ بھی لکھے تھے۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب مولانا کلکتہ کے ایک دینی اور تبلیغی ادارہ سے وابستہ تھے، اس ادارہ کا نام اب مجھے یاد نہیں رہا۔

ابھی میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت طالب علم ہی کے مقیم تھا کہ مولانا علاقہ مدراس کے کسی مدرسہ میں بھیج دیئے گئے۔ دینی مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کے اُس زمانہ کے معیار کے لحاظ سے وہاں مولانا کی تنخواہ بہت معقول تھی، مولانا کے پاس جلدی ہی حج کے قابل روپیہ جمع ہو گیا۔ مولانا نے فریضۂ حج کی ادائیگی میں تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور حج کو روانہ ہو گئے۔ اس طرح مولانا نے حج بھی بالکل نوجوانی ہیں اس دور میں کیا جب کہ سفرِ حج سخت مجاہدہ کا سفر تھا اور نئی عمر میں حج کو جانے کا رواج بہت ہی کم تھا۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت)

میری طالب علمی کے آخری سال کے بالکل آخری ہفتوں میں تقدیر الٰہی سے کچھ واقعات دارالعلوم دیوبند میں ایسے پیش آئے کہ اس وقت کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین استاذنا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح اور ان دونوں بزرگوں کے ساتھ اساتذہ کی اچھی خاصی تعداد نے دارالعلوم دیوبند سے اپنے آپ کو الگ کر لیا اور شر سے اللہ تعالیٰ نے یہ خیر پیدا فرمایا کہ گجرات میں ایک عظیم الشان دارالعلوم (جامعہ اسلامیہ ڈابھیل) قائم ہو گیا اور یہ سب حضرات وہیں منتقل ہو گئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب چونکہ استاذنا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق رکھتے تھے اس لیئے وہ بھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) چلے گئے۔ یہاں اس کا بھی اظہار مناسب ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند کی اصلاح کی جس تحریک یا کوشش کے نتیجہ میں یہ واقعات پیش آئے تھے، اس میں مولانا حفظ الرحمان صاحب کا خاص حصہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ اس ناچیز کا تعلق بھی اسی زمانہ سے شروع ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند والی برادری کے علاوہ ہم دونوں کو جوڑنے والا خاص رشتہ حضرت استاذ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق و رابطہ تھا اس کے سوا ہم دونوں میں ایک درجہ کی ہم مذاقی بھی تھی۔ دونوں کا مزاج یہ تھا کہ جس چیز کو غلط سمجھیں اُس کے خلاف جنگ کریں۔ اگرچہ وہ اس میں بہت آگے تھے اور یہ عاجز پیچھے، اس وقت سیاست کے میدان میں تو خاموشی تھی اس لیئے اس کے علاوہ جو دینی و ملی کام ہو رہے تھے اور جو خاص جلسے اور اجتماعات ان کے سلسلہ میں کبھی کبھی ہوتے تھے ان میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی خاص کر جمعیۃ کے جلسوں میں۔

سنہ ۳۰ء کی جنگ آزادی میں مولانا کی شرکت

اسی زمانہ میں جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے متعلق تھے یہ واقعہ پیش آیا کہ جمعیۃ العلماء ہند جو اپنے یوم پیدائش ہی سے جنگ آزادی میں کانگریس کے ساتھ شریک اور اس کی رفیق تھی۔
نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوجانے کی وجہ سے ۱۹۲۹ء میں اس نے اپنی راہ کانگریس سے الگ کرلی۔ اس کے قریباً ایک سال بعد ۱۹۳۰ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اور اس میں نہرو رپورٹ منسوخ قرار دے کر آزادی کی جنگ شروع کردینے کا اختیار گاندھی جی کو دے دیا گیا۔ گاندھی جی نے حکومت کو ایک نوٹس دینے اور گویا اتمام حجت کردینے کے بعد نمک سازی کی شکل میں سول نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کردی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ڈابھیل سے جاکر گاندھی جی کی اس نمک سازی کی تحریک میں شریک ہوئے۔
میں اس زمانہ میں امروہہ میں مدرس تھا، کسی ضرورت سے دہلی جانا ہوا تھا واپسی میں محض اتفاق سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوگئی، وہ ڈابھیل یا احمد آباد سے آرہے تھے اور اپنے وطن سیوہارہ جانے کے لیے دہلی سے مرادآباد جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے تھے مجھے بھی اسی ٹرین سے امروہہ آنا تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ ہم میں سے پہلے کس نے دوسرے کو دیکھا۔ بہرحال ملاقات ہوگئی اور دونوں ایک ہی ڈبہ میں بیٹھے، دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ مولانا نمک سازی کی سول نافرمانی میں گاندھی جی کے ساتھ کام کرکے واپس آرہے ہیں۔
مولانا کے ساتھ ایک پڑیا میں بندھا ہوا اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا نمک بھی تھا جو میری فرمائش پر انہوں نے نکال کر دکھایا اور میرے ساتھ ٹرین کے عام مسافروں نے بھی بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

امروہہ میں جمعیۃ کا تاریخی اجلاس اور مولانا حفظ الرحمٰن

اسی ۱۹۳۰ء میں بلکہ اسی زمانہ میں جب گاندھی جی نے نمک کی تحریک شروع کی تھی امروہہ میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس ہوا اس اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ کئی مہینہ پہلے ہوچکا تھا۔ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ اس زمانہ میں میرا قیام بھی امروہہ ہی میں تھا۔ اس وقت جمعیۃ العلماء کا ایک ممبر اور اس کی برادری کا ایک فرد ہونے کے علاوہ اس اجلاس سے میری غیر معمولی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہوگئی تھی کہ امروہہ میں جو عنصر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا پیرو تھا۔ اس نے جمعیۃ کے اجلاس کو ناکام بنانے ہی کی غرض سے ٹھیک انھیں تاریخوں میں جن میں جمعیۃ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم کی بنائی ہوئی اس "نئی جمعیۃ علما کانپور" کا اجلاس امروہہ ہی میں رکھ دیا جو کچھ ہی دنوں پہلے "جمعیۃ العلماء ہند دہلی" کی مخالفت ہی میں بنائی گئی تھی اور جمعیۃ العلماء ہند کے خلاف ان ناخدا ترسوں نے زور شور کے ساتھ امروہہ اور اس کے اطراف میں پروپگنڈہ شروع کردیا کہ یہ صرف وہابیوں دیوبندیوں کی اور (معاذ اللہ) دشمنان رسول کی جماعت ہے۔"
بہرحال اس حملہ اور اس چیلنج نے قدرتی طور پر ہم لوگوں کو بہت متاثر کیا تھا جو جمعیۃ کے ساتھ ساتھ اکابر دیوبند سے بھی وابستہ تھے اور پھر ہم نے بھی جمعیۃ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے جی جان کی بازی لگادی۔

اُس وقت کا سیاسی ماحول

اُس وقت کا سیاسی ماحول یہ تھا کہ ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک کوئی عوامی سیاسی تحریک نہ چلنے کی وجہ

سے ایک قسم کی بے حسی اور جمود پیدا ہوگیا تھا۔ خاص کر مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ پہلے تو شدھی سنگٹھن کی تحریک اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے ان کو بددل کیا تھا۔ اور بعد میں نہرو رپورٹ کے قضیہ نے ان کے بہت سے ان عناصر کو بھی کانگریس سے دور کردیا تھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہے تھے غرض کہ ان وجوہ سے کانگریس کی چھیڑی ہوئی اس جنگ کے لیے مسلمانوں میں کوئی امنگ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی درجہ کی ہمدردی بھی اس وقت نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس صرف دو چار کو مستثنیٰ کرکے ان کے عام اخبارات اور مولانا محمد علی و شوکت علی مرحوم جیسے ان کے لیڈر بھی اس کے خلاف تھے۔ کہ اس جنگ میں مسلمان شریک ہوں، بہر حال یہ فضا تھی جس وقت کہ جمعیۃ کا اجلاس امروہہ میں ہونے والا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا ریزولیشن

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو اُس وقت جمعیۃ کے اکابر میں یا ہائی کمانڈ میں نہیں تھے مگر اپنے سیاسی ذہن اور جرأت و فعالیت کی وجہ سے اپنے اقران میں سب سے زیادہ ممتاز تھے) کانگریس کی جنگِ آزادی میں شرکت کے متعلق ایک ریزولیشن اجلاس کی تاریخ سے کافی دنوں پہلے ہی دفتر کو بھیجدیا اور ساتھ ہی اشاعت کے لیے اُسے اخبارات کو بھی دے دیا، اس وقت خود جمعیۃ کے اندر اس مسئلہ پر خاص اختلاف رائے تھا بلکہ اجلاس شروع ہونے کے دن تک جمعیۃ کے جو ارکان مختلف مقامات سے امروہہ پہونچے تھے ان سب کی نجی گفتگوؤں کا خاص موضوع مولانا حفظ الرحمٰن کا یہ ریزولیشن ہی بنا ہوا تھا ان کی باتوں سے ہم لوگوں نے اندازہ یہ کیا تھا کہ ریزولیشن پاس نہ ہو سکے گا۔ بہر حال اجلاس شروع ہوا۔ سب سے پہلے دستور اور قاعدہ کے مطابق صدر استقبالیہ (سید ابو المنظر رضوی مرحوم) نے خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد اجلاس کے صدر منتخب حضرت مولانا شاہ معین الدین صاحب اجمیریؒ کا خطبہ صدارت پڑھا گیا۔ ان دونوں خطبوں میں شدّ و مد کے ساتھ اور خاص کر خطبہ استقبالیہ میں استدلال کے پورے زور کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی اس تجویز کے خلاف رہ نمائی دی گئی تھی لیکن جب مسئلہ سبجکٹ کمیٹی میں آیا تو مولانا کی اس تجویز کو چار نہایت اہم اور باوزن شخصیتوں کی حمایت اور تائید حاصل ہوگئی۔ ایک جمعیۃ العلماء کے اس وقت کے مستقل صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رح، دوسرے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح۔ تیسرے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح اور چوتھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری رح۔ یہ ناچیز سبجکٹ کمیٹی میں شریک تھا۔

جب اس ریزولیشن پر بحث شروع ہوئی تو ایک دو موافقانہ اور مخالفانہ تقریروں کے بعد حضرت مفتی صاحب اور سید صاحب نے علی الترتیب بڑی مدلل اور بصیرت افروز تقریریں ریزولیشن کی حمایت میں پیش کیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمانی جذبہ و جوش اور درد سے بھری ہوئی ایک تقریر فرمائی جس میں ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کی اہمیت اور خاص کر مسلمانوں کے لیے اس کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ حضرت ممدوح نے ماضی قریب اور ماضی بعید کے تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انگریزوں نے عالم اسلامی کے ساتھ کیا کیا ہے پوری دنیا کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں انگریزوں کا کتنا حصہ ہے اس لیے مسلمانوں کے دشمن ۱ انگریز اور صرف انگریز ہیں لہٰذا انگریزی اقتدار کے

خلاف جو جنگ کسی کی طرف سے شروع ہو۔ ہمیں بلا شرط اس میں شریک ہو کر اس کو تقویت پہونچانا چاہیئے

حضرت مولانا کی ذاتی عظمت کے ساتھ ان کی اس درمندانہ اور جذبات سے بھرپور تقریر نے شرکار اجلاس میں سے بہت سوں کی رائے بدل دی، اس کے بعد جو کمی کسر رہی تھی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ساحرانہ خطابت نے پوری کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز نہ صرف یہ کہ پاس ہوئی بلکہ تقریباً بالاتفاق پاس ہوئی، جن چند حضرات کو اس سے اتفاق نہیں تھا انھوں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی۔ سوائے ایک دو صاحبوں کے۔

یہ واقعہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جس ناموافق ماحول میں اپنی یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کی تھی اور اخبارات میں اعلان کیا تھا اور پھر جس شان کے ساتھ وہ پاس ہوئی، اس نے مولانا کو اس نوعمری ہی میں سیاسی دُنیا میں خاص اہمیت دے دی، اس کے بعد سے برابر وہ اس میدان میں اپنی خاص صلاحیتوں اور قربانیوں کی وجہ سے آگے ہی بڑھتے رہے۔

سب کچھ ملّت کے لیئے

اُن کے جاننے والے سب جانتے ہیں کہ اس میدان میں اُنھوں نے جو کچھ کیا اور جو قربانیاں دیں وہ ملّت ہی کے لیئے دیں، وہ اُس وقت اپنے اور اپنی جماعت کے سیاسی موقف کی تائید میں کہا کرتے تھے اور یقین و اعتماد کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جنگ کامیاب ہوکر رہے گی۔ دیر یا سویر انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ اگر آزادی کی جنگ میں اور اُس کی قربانیوں میں ہمارا حصہ نہ ہوا تو آزادی کے ثمرات میں بھی ہمارا حصّہ نہ ہوگا اور ہم رعایتوں کی بھیک مانگا کریں گے۔ لیکن آج اگر ہم جنگ میں شریک ہوں گے اور قربانی دیں گے تو کل جب ملک آزاد ہوگا تو ہم بھی اُس میں برابر کے حصہ دار ہوں گے اور ہمیں حق ہوگا کہ "ڈنڈا لے کر کھڑے ہوں"، اور کہیں کہ ہم بھی ملک کے لیئے لڑے تھے اور ہم نے بھی قربانیاں دی تھیں اس لیئے ملک کی آزادی میں ہمارا بھی حصّہ ہے۔ (مولانا کی اس طرح کی تقریر ناچیز کو کئی دفعہ کی یاد ہے اور بالخصوص "ڈنڈا لے کر کھڑے ہونے کے الفاظ خاص انھیں کے ہیں)

بہرحال ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مولانا نے جنگِ آزادی کے سلسلے میں جو کچھ کیا اور جو قربانیاں دیں وہ اسی نیت سے اور گویا اس چیز کو بطور نصب العین کے سامنے رکھ کر دیں اور وقت آنے پر پورے ملک نے اور پوری ملّتِ اسلامیہ نے دیکھ لیا کہ آزادی کے بعد جب مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں کی گئیں تو اُس بندۂ خدا نے اُس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا کہ اس آزادی کے لیئے ہم نے بھی قربانیاں دی ہیں اور ہمارا بھی اس میں برابر کا حصّہ ہے اس لیئے کسی ناانصافی اور حق تلفی کو ہم برداشت نہیں کریں گے۔

سب سے بڑی خدمت

آزادی کے بعد ملت کے لیئے جو کچھ مولانا نے کیا اور جو خدمات انجام دیں، سب جانتے ہیں کہ اس کی فہرست کتنی طویل ہے لیکن ان کی سب سے بڑی خدمت اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے

جس کی توفیق اللہ نے ان کو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دی تھی۔ جس وقت دہلی میں مسلمان محلوں کو لوٹا اور جلایا جارہا تھا اور مسلمانوں کا گویا قتل عام ہورہا تھا اور کسی مسلمان کا اپنے گھر یا اپنے خاص حلقہ سے باہر نکلنا گویا موت کے مونھ میں جانا تھا..... اُس وقت مولانا حفظ الرحمٰن اپنا سر ہتھیلی پر رکھے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اسی دِلّی میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کبھی پنڈت نہرو اور مولانا آزاد اور دوسرے ذمہ دارانِ حکومت سے ملتے، کبھی خطروں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کے پاس پہنچتے اور اُنھیں محفوظ مقامات پر منتقل کرنے کا انتظام کرتے

پھر جب گاندھی جی دلّی آگئے تو مولانا حفظ الرحمٰن ہی نے اُن کے سامنے دِلّی کی اُس وقت کی صورتِ حال رکھی۔ اور زبان سے اور ساتھ ہی ڈاڑھی پر بہتے ہوئے آنسوؤں سے کہا کہ ہندوستان کی ہماری راجدھانی میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیا ہورہا ہے۔ گاندھی جی کو چونکہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پر اعتماد تھا اس لیے وہ بے حد متاثر ہوئے اور وزیراعظم پنڈت نہرو، وزیرداخلہ سردار پٹیل اور کابینہ کے تیسرے اہم رکن مولانا آزاد مرحوم سے گفتگو کرنیکے بعد بھی جب وہ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہیں ہوئے تو انھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف پروٹسٹ کے طور پر مرن برت کا اعلان کردیا۔ حالات کو درست کرنے کے لیے یہ آخری ہتھیار تھا جو گاندھی جی استعمال کرسکتے تھے۔ یعنی انھوں نے فسادات کو روکنے اور ملک میں امن قائم کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی۔ گاندھی جی کی شخصی عظمت کا ملک اور حکومت پر جو اثر پڑسکتا تھا اُس کے علاوہ اس برت کا ایک اہم اور دُور رس پہلو یہ بھی تھا کہ گاندھی جی کی طرف سے گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ حکومت امن قائم کرنے اور مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی اور اُس کی انتظامی مشنری پر اس بارے میں اب مجھ کو بھروسہ نہیں ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اُن کے اس برت کا ملک کے عوام پر اور خصوصیت کے ساتھ حکومت پر بہت اثر پڑا اور اُسی دن سے ہوا کا رخ بدلنے لگا اور امید پیدا ہوگئی کہ برت کے نتیجہ میں امن قائم ہوجائے گا۔

چند روز کے بعد جب حکومت اور عوام کے نمائندوں نے گاندھی جی کے سامنے امن کی ذمہ داری لی اور انھیں اطمینان دلایا تو گاندھی جی نے چند شرطیں قبول کراکے برت توڑ دیا۔ کہنا یہ ہے کہ گاندھی جی کے برت نے ملک میں امن کی جو فضا قائم کی اور مسلمانوں کے قتل وغارت اور لُوٹ مار کا جو سلسلہ اُس وقت ختم ہوا وہ بالواسطہ مولانا حفظ الرحمٰن کا کارنامہ ہے۔ اگر موصوف جرأت واعتماد سے کام لے کر گاندھی جی کے سامنے بات اس طرح نہ رکھتے تو اصلی صورتِ حال گاندھی جی کو کبھی نہ معلوم ہوسکتی اور خدا ہی جانتا ہے کہ خون کا وہ سیلاب کب تک جاری رہتا۔

خدمت کا ایک لامتناہی سلسلہ

پھر ۱۹۴۷ء کے بعد سے اس ۱۹۶۲ء تک کے پندرہ سالوں میں وہ برابر ملت ہی کے کاموں میں لگے رہے اس عرصہ میں جب کبھی اور جس وقت بھی دفتر جمعیۃ میں اُن کے پاس دِلّی جانا ہوا تو یہی دیکھا کہ مختلف مقامات کے مسلمان اُن کو گھیرے ہوئے ہیں اور اپنے مسائل ومصائب اُن کے سامنے رکھ رہے ہیں اور مولانا جو کچھ ان کے لیے کرسکتے ہیں کررہے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندوؤں

اور سکھوں کو بھی دیکھا کہ وہ اپنے اُن کاموں کے لیے جو حکومت سے متعلق ہیں اُن کے پاس آتے اور مولانا اُن کے لئے بھی جو کچھ کرسکتے اُس میں دریغ نہ کرتے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کی اُن کی شدید مصروفیت دیکھ کر اُن پر رشک بھی آتا تھا اور دل میں برابر اُن کی وقعت بڑھتی تھی۔ یہ مسائل جن کو لے کر لوگ اُن کے پاس آتے تھے عموماً شخصی اور جزئی ہوتے تھے لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اُنھوں نے کسی سے یہ کہا ہو کہ بھائی یہ شخصی اور جزوی مسائل ہیں، میرے سامنے ملّت کے بڑے اجتماعی مسائل ہیں جن سے مجھے فرصت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اُن جیسا شخص یہ کہتا تو بالکل بے جا نہ ہوتا۔ اُن سے اپنا کام کرانے کے لیے کسی تعلق، تعارف اور سفارش کی بالکل ضرورت نہ تھی جو کچھ کرسکتے تھے اُس کے لیے کسی سے دریغ نہیں تھا۔

کوئی دو برس پہلے کی بات ہے وہ کسی کام سے لکھنؤ تشریف لائے، اپنے معمول کے مطابق ملاقات کے لیے میرے پاس بھی تشریف لائے اور تشریف لے گئے۔ تین چار ہی دن کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ایک کام کے سلسلے میں ہم دونوں کو دیوبند میں جمع ہونا تھا۔ جب ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ اُس دن جب میں لکھنؤ سے روانہ ہونے لگا اور ٹرین میں بیٹھ گیا تو ایک صاحب آپ کا سفارشی خط لے کر پہنچے، میں نے ان سے کہا کہ بھائی جب میں امکانی خدمت کے لیے یوں ہی حاضر ہوں تو آپ لوگ میرے دوستوں کو سفارش کے لیے کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مولانا نے بتایا کہ خدا کے فضل سے اُن صاحب کا وہ کام کل ہوگیا مجھے مولانا سے یہ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں کسی کے لیے کوئی سفارش نہیں لکھی۔ وہ خط جعلی ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں تمہارے قلم کا تو نہیں تھا بلکہ اُس شخص نے بتایا بھی تھا کہ مولانا کو جلدی تھی اس لیے خط اُنھوں نے خود اپنے قلم سے نہیں لکھا ہے بلکہ دوسرے آدمی سے لکھوایا ہے۔ بہرحال لوگ ایسی حرکتیں بھی کرتے تھے، لیکن جیسا کہ میں نے ابھی بتایا مولانا اپنے پرائے، متعلق، غیر متعلق، متعارف، غیر متعارف ہر ایک کی خدمت کے لیے حاضر تھے، میں جتنا بھی غور کرتا ہوں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ بہت ہی بڑی بات ہو

یادگار کارنامہ

ملّت کی خدمت کے اس لامتناہی سلسلہ کے علاوہ اسی سلسلہ کا اُن کا ایک عظیم اور قابلِ یادگار کارنامہ یہ بھی ہے کہ حکومتی پارٹی کانگریس کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہونے والی بے انصافیوں اور خاص کر فسادات کے سلسلہ میں اُنھوں نے پارلیمنٹ کے ایوان میں جس طرح کی تقریریں پچھلے چند برسوں میں کیں (جو پارلیمنٹ کے ریکارڈ اور اخبارات کی فائلوں میں محفوظ ہیں) اُن میں اُنھوں نے ملت کی مخلصانہ اور دردمندانہ وکالت اور حق گوئی و بیباکی کا حق ادا کر دیا ہے۔

اور اس "مجاہدانہ گفتار" کے علاوہ فسادات کے سلسلے میں ان کا مستقل "خادمانہ کردار" یہ رہا کہ ملک کے جس حصے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی اُنھوں نے وہاں جلدی سے جلدی پہنچنے کی کوشش کی اور وہ جو کچھ کرسکتے تھے اُس کے کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا اور ان کاموں کے تقاضے کے سامنے اپنی صحت بلکہ زندگی تک کے مسئلہ کو بھی بھلا دیا۔

پچھلے سال نومبر میں علی گڑھ وغیرہ میں فسادات ہوئے تو انھوں نے علی گڑھ کا دورہ اُس حالت میں کیا کہ ان کے پھیپھڑے میں کینسر ہو چکا تھا اور اُس کے اثر سے پانی کی کافی مقدار پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے کھانسی کی سخت تکلیف تھی، جسم گھلا جا رہا تھا لیکن انھیں اپنے اس حال کی کچھ خبر نہ تھی اور ڈاکٹری معائنہ کرانے کے لیئے انھیں فرصت نہیں مل رہی تھی۔ علی گڑھ سے انھیں سیدھا دیوبند آنا تھا۔ یہاں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا اُسی دن اجلاس تھا۔ ہم لوگ پہلے پہنچ چکے تھے لیکن مولانا راستہ میں موٹر فیل ہو جانے کی وجہ سے چار پانچ گھنٹے لیٹ پہنچے۔ ہم لوگوں نے اُن کی کھانسی کی تکلیف اور اُن کی صورت دیکھ کر اُن سے کہا کہ خدا کے لیئے آپ اپنے اوپر رحم کریں، چند روز آرام کرلیں اور قاعدہ کا علاج کرالیں۔ بہرحال اُس دن دیوبند ہی میں یہ بات طے ہو گئی کہ اب وہ دہلی پہنچ کر سب سے پہلے ڈاکٹری معائنہ کرائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن ملت کی بدنصیبی کہ ڈاکٹری معائنہ سے معلوم ہوا کہ اُن کی کھانسی معمولی کھانسی نہیں ہے بلکہ ان کے پھیپھڑے میں پانی کی بہت بڑی مقدار ہے۔ پانی نکالا گیا اور علاج شروع ہوا، چند روز کے بعد طے ہوا کہ مولانا علاج کے لیئے بمبئی جائیں وہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ مولانا تو کینسر میں مبتلا ہیں اور پھیپھڑے میں پانی اسی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال کہنا یہ تھا کہ وہ پھیپھڑے میں کینسر لیئے ہوئے اور پانی بھرے ہوئے ملت ہی کے کاموں سے علی گڑھ اور دیوبند دوڑ رہے تھے۔

اتفاق یا لطیفۂ غیبی

یہ عجیب اتفاق ہے یا لطیفۂ غیبی کہ بسترِ علالت پر مستقل لیٹ جانے سے پہلے ملت کے کاموں کے سلسلے میں مولانا کی زندگی کا آخری سفر علی گڑھ اور دیوبند کا ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا دنیوی مرکز، دارالعلوم دیوبند اُس کا دینی مرکز۔

مولانا کا خاص جوھر

اس عاجز کی نظر میں مولانا کا خاص جوہر جو اُن کے مختلف النوع محاسن اور کارناموں کا گویا سرچشمہ تھا وہ ان کی جرأت و فعالیت، محنت و جفاکشی اور خود اعتمادی تھی وہ جس چیز کو صحیح اور ضروری سمجھتے تو حالات خواہ کیسے ہی ناسازگار ہوتے وہ مایوس نہ ہوتے اور اس کے لیئے جدوجہد کے میدان میں کود پڑتے اور محنت و جانفشانی سے میدان اکثر سر ہی کر لیتے۔

عیش پسندی اور آرام طلبی سے انھوں نے ہمیشہ اپنے کو دُور رکھا۔ آزادی سے پہلے تو گویا مسلسل زمانۂ جنگ تھا اور مولانا کا تبادلہ گھر سے جیل اور جیل سے گھر کی طرف ہوتا رہتا تھا۔ اس زمانہ کی مستقل عادتوں میں سے ان کی ایک عادت بھی تھی کہ دن کو وہ ہمیشہ زمین پر سوتے تھے تاکہ جیل کی زندگی میں زمین پر سونا شاق نہ ہو۔ یہ عادت انھوں نے آزادی کے بعد بھی بلکہ پارلیمنٹ کی ممبری کے زمانہ میں بھی قائم رکھی۔ سہ پہر کو جب پارلیمنٹ کے اجلاس سے جمعیۃ کے دفتر واپس آتے تو ظہر کی نماز پڑھ کر ہمیشہ زمین ہی پر سوتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا اور عاجز کا قیام کہیں ساتھ ہوا۔ مولانا نے اپنے معمول کے مطابق زمین پر سونا چاہا، مجھے یہ بات بہت

بُری معلوم ہوئی کہ میں پلنگ پر سوؤں اور مولانا زمین پر۔ اس لیئے میں نے بھی ان کے ساتھ زمین پر سونا چاہا لیکن مولانا نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ مجھے بارمان کے ان کی فرماں برداری کرنا پڑی۔

رائے میں صلابت

مولانا کی ایک خصوصیت ان کی رائے کی صلابت اور مضبوطی سے اپنے موقف پر قائم رہنے کی عادت تھی۔ الاّ یہ کہ خود اپنی رائے بدل جائے یا وہ خود معاملہ کو غیر اہم اور قابل درگذر سمجھکر اپنی رائے پر اصرار مناسب نہ سمجھیں۔ اس معاملہ میں مولانا اتنے پکے تھے کہ ایک بڑے سے بڑے واجب الاحترام بزرگ کی رائے سے اگر کسی معاملہ میں انکو اختلاف ہوتا اور وہ اس کو اہم سمجھتے تو پوری قوت سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے اور اپنا موقف چھوڑنے کے لیئے کسی طرح آمادہ نہ ہوتے ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس دہلی میں مولانا عبدالحق مدنی رح کی صدارت میں ہوا تھا اس میں اس وقت کے اٹھے ہوئے مسلمانوں کے ایک خاص مسئلہ کے بارے میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح ایک تجویز پاس کرانا چاہتے تھے اور حضرت ممدوح کو اس پر اصرار تھا۔ مولانا حفظ الرحمان صاحبؒ اور ارکان جمعیۃ میں سے چند اور صاحب رائے حضرات اس کو مناسب نہیں سمجھتے تھے لیکن جب حضرت شیخؒ نے اس کے حق میں اپنے خاص انداز میں تقریر فرمائی جس میں برہمی کا عنصر بھی شامل تھا تو اور سب حضرات نے توخاموشی ہی میں خیریت سمجھی لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اس خاص نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق کے باوجود جو ان کو حضرت شیخ رح سے تھا (جس کو سب جاننے والے جانتے ہیں) پوری مضبوطی کے ساتھ اپنی رائے پر قائم رہے اور جب تجویز اکثریت کی تائید سے پاس ہوگئی تو انھوں نے مفصل اور مدلل اختلافی نوٹ لکھا اور اصرار کیا کہ میرا اختلافی نوٹ کارروائی میں شامل کیا جائے اور اس کو شامل کرا کے چھوڑا۔

غالباً دو سال پہلے کی بات ہے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ یا عاملہ کے اجلاس کے موقع پر کسی سلسلہ گفتگو میں مولانا نے اس عاجز سے فرمایا کہ اپنے اکابر سے پوری عقیدتمندی کے باوجود ان میں سے کسی کی بیعت میں صرف اس وجہ سے نہیں کرسکا کہ اس تعلق کے بعد ہمارا ماحول اختلاف رائے کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ اور اس کو بے ادبی اور محرومی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اسی سلسلۂ گفتگو میں مجھے پہلی دفعہ مولانا سے یہ معلوم ہوا کہ باضابطہ بیعت کے بغیر ان کا ایک گونہ اصلاح کا تعلق مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب عثمانی نقشبندی رح سے رہا تھا۔ البتہ اس آخری علالت کے دوران مولانا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب غالباً وہ اس خانے کو بھی پُر کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ عرفی طور پر کسی شیخ سے بیعت نہ ہونے کے باوجود اپنے اکابر و مشائخ کے ساتھ ان کو جو گہرا قلبی تعلق تھا اور ان حضرات کی جو شفقت ومحبت اپنی ملی خدمات کی وجہ سے ان کو حاصل تھی اس کے ہوتے ہوئے عرفی بیعت نہ ہونے سے کوئی خاص کمی نہیں رہتی۔ ہمارے اکثر اکابر و مشائخ کی نگاہ میں عرفی بیعت کی وہ اہمیت نہیں ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے ہم نے اپنے صاحب ارشاد اکابر سے بارہا سنا ہے کہ اصل چیز بس مخلصانہ تعلق و محبت ہے اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔

تواضع اور وضع کی پابندی

مولانا اپنی ملی اور ملکی خدمات کی وجہ سے خاص کر ۱۹۴۷ء کے بعد اگرچہ ایک بلندترین مقام پر فائز تھے اور مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ملک کی بھی صفِ اول کی شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا لیکن یہ واقعہ یہ ہے کہ اس بلند مقامی کی وجہ سے اس شخص میں بڑائی کی ذرا بھی خو بو نہیں آئی۔ بعض نا واقف حضرات کو ان کے پرزور انداز گفتگو سے شبہ ہو جاتا تھا کہ وہ شاید احساسِ بالاتری میں مبتلا ہیں لیکن ان کے سب جاننے والے جانتے ہیں کہ اس بیماری نے اللہ کے اس بندے کو چھوا بھی نہیں تھا۔ دراصل ان کا بات کرنے کا یہ انداز ہمیشہ سے اور بالکل فطری تھا۔ خاص کر بحث اور اختلاف رائے کے موقع پر اپنے بے تکلف دوستوں بلکہ بڑوں کے سامنے بھی ہمیشہ سے اسی انداز میں بات کرتے تھے۔ بہرحال یہ انداز گفتگو ان کا بالکل فطری تھا۔ نیچے سے نیچے کی سطح کے جن آدمیوں کے ساتھ بھی جو تعلق اور برتاؤ ان کا بیس پچیس سال پہلے تھا وہی اس آخری دور میں بھی رہا۔

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی یا مدرسی کے زمانہ سے ان کا یہ معمول تھا کہ عشاء کے بعد کسی حجرہ میں کچھ دیر بیٹھتے اور یہ مجلس بڑی بے تکلف گویا یار پارٹی ہوتی۔ بعض طلباء بھی شریک ہو جاتے۔ مولانا نے اب تک اپنی اس وضع کو اس طرح نباہا کہ آندھی مینہہ کچھ ہو لیکن مولانا جب دیوبند میں ہوتے تو عشاء کے بعد کی یاروں کی یہ مجلس قضا نہ ہوتی۔ یہ عاجز چونکہ عشاء کے بعد جلد ہی سونے کا عادی ہے اور مزاج بھی قدرت نے کچھ خشک اور کم آمیز بنایا ہے اس لیئے افسوس ہے کہ مجھے کبھی اس لطف صحبت میں شرکت کا موقع نہیں ملا۔ بس مولانا ہی سے کبھی اس کی روداد سن لیتا۔

دارالعلوم دیوبند سے تعلق

مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں پڑھا اس کے بعد بحیثیت استاد بھی کچھ دن وہاں رہے اور اب قریبًا اٹھارہ اُنیس سال سے اس کی مجلسِ شوریٰ کے اہم ترین رکن تھے۔ لیکن دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کے ساتھ مولانا کا تعلق ان سب تعلقات سے (جو صرف قانونی اور ضابطہ کے بھی ہو سکتے ہیں) بالاتر گہرا روحانی اور قلبی تعلق تھا وہ دارالعلوم کو صرف ایک عظیم دینی درسگاہ اور اپنی مادرِ علمی ہی نہیں بلکہ دینی مسلک اور روحانی مرکز یقین کرتے تھے اور اسی حیثیت سے اس سے گہری وابستگی رکھتے تھے وہ ملت کے وقتی تقاضوں کے مطابق روشن خیال اور وسیع المشرب ہونے کے باوجود دینی مسلک اور طرز فکر میں جماعت دیوبند کے اکابر واسلاف کے گویا پورے مقلد تھے۔ ملت کے اجتماعی مسائل اور مصالح کے پیشِ نظر خاص کر ۱۹۴۷ء کے بعد کبھی کبھی ایسے بعض کام بھی انھیں کرنے پڑے جو بظاہر اُن کے اور اُن کے اکابر کے مسلک کے خلاف تھے۔ لیکن وہ انہوں نے سوچ سمجھ کر شریعت کے اختیارِ اَھْوَنُ البلیتین کے اصول پر کیئے پھر بھی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں تو ایک دنیا دار آدمی ہوں۔ میرا عمل سند نہیں ہے۔ مسئلہ وہی ہے جو علمائے حق بتائیں اسی طرح اگر کبھی انھوں نے کوئی ایسا کام کیا جو بظاہر ان کی غیر معمولی جرارت مندی اور بے لاگ حق گوئی و بیباکی سے میل نہیں کھاتا تو وہاں بھی انہوں نے اپنی فہم کے مطابق ملت کی اجتماعی مصلحت کو مقدم رکھکر اپنی فطری خودی کو دبایا۔ اور انشاء اللہ وہ اپنے اس مجاہدے اور قربانی پر اجر کے مستحق ہوں گے۔

تقریر و تصنیف

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے تقریر و بیان کا جو ملکہ دیا تھا اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ملک کا وہ کونسا گوشہ ہے جہاں کے لوگوں نے ان کی تقریریں نہیں سنیں تقریر و خطابت کا یہ ملکہ اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ تھا اور مولانا نے ملک وملت کے لیے اسے خوب استعمال کیا۔ خاصکر پارلیمنٹ کی ان کی تقریریں تو یادگار رہیں گی۔

تقریر کی طرح تحریر اور تصنیف و تالیف سے بھی مولانا کو خاص مناسبت تھی جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے سب سے پہلی کتاب "بلاغ مبین" لکھی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دعوت ناموں کو جمع کیا تھا جو آپ نے اپنے زمانے کے چھوٹے بڑے فرمانرواؤں کو بھیجے تھے، ان میں سے ہر ایک کے متعلق مفصل تاریخی بحث بھی کی تھی۔ یہ کتاب مولانا نے غالباً ۱۹۱۵ء میں لکھی تھی اس کے بعد قومی وملی خدمات کے ساتھ ساتھ رجن کے سلسلے میں بار بار جیل بھی جانا پڑا، ۱۹۴۷ء تک تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور اس عرصہ میں "اسلام کا اقتصادی نظام"، "فلسفۂ اخلاق"، اور چار جلدوں میں "قصص القرآن"، جیسی ضخیم کتابیں آپ نے لکھیں۔ مولانا فطری طور پر ان مصنفوں میں تھے جو تھوڑے وقت میں زیادہ لکھتے ہیں، اگر وہ دوسرے کاموں سے یکسو ہوکر صرف تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو اپنے زمانہ کے کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتے اور غالباً ہر مہینہ دو مہینے میں ایک کتاب تیار کر دیا کرتے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ ملتِ اسلامیہ ہند کے کاموں میں ہمہ تن ایسے مشغول ہوگئے کہ اس کے بعد لکھنے لکھانے جیسے کسی علمی کام کی ان کے اوقات میں بالکل گنجائش نہیں رہی اس کے باوجود زندگی کے آخری دو سالوں میں انہوں نے دوڑتے بھاگتے دو کام کر ڈالے۔ ایک سیرت پر اپنی قدیم تصنیف "رسولِ کریم"، کو گویا دوبارہ لکھا جس کے بعد ضخامت کے لحاظ سے بھی وہ سابق کے مقابلہ میں قریباً دوچند ہوگئی ہے (اب سے تھوڑے ہی دنوں پہلے "رسولِ کریمؐ"، کا یہ جدید ایڈیشن شائع ہو چکا ہے) دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ "قصص القرآن"، کی پہلی جلد جو تحقیق کے معیار سے خود ان کی نگاہ میں بھی ہلکی ہوگئی تھی اس کو انھوں نے پچھلے دنوں میں گویا از سرِ نو مرتب کیا، انشاء اللہ عنقریب یہ بھی چھپ کر سامنے آجائے گی۔

آخری علالت اور سانحۂ وفات

میں یہ بات پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ گذشتہ دسمبر میں دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کی شرکت کے لیے جب مولانا علیگڑھ سے دیوبند پہونچے تو وہ سخت کھانسی میں مبتلا تھے اور صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا جسم گھلا جارہا ہے، ہم لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ کچھ دن کے لیے سفر اور دوسرے کام چھوڑ کر علاج کرائیں اور آرام کریں۔ اس کے چند روز بعد ہی جب ڈاکٹروں نے مولانا کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے پھیپھڑے میں پانی کی کافی مقدار ہے۔ چنانچہ دلی میں وہ پانی نکالا گیا اس کے بعد مولانا علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے۔ جن دنوں مولانا بمبئی میں زیرِ علاج تھے، رفیقِ مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کویت کے سفر سے واپسی میں بمبئی ٹھہرے، میں نے ان کو لکھدیا تھا کہ وہ بمبئی میں مولانا کو دیکھ کر آئیں اور ممکن ہو تو ان کے معالجوں سے بھی ان کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ مولانا ندوی ہسپتال میں مولانا سے بھی ملے اور وہاں کے ایک معالج

مشرب دیوبند ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶۲ء

ڈاکٹر سے پرائیویٹ طور سے بات کرنے کا بھی ان کو خاص موقع مل گیا۔ اس نے بتایا کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے پھیپھڑے میں کینسر ہے اور اس کا محل وقوع ایسا نازک ہے کہ نہ آپریشن کیا جا سکتا ہے اور نہ برقی شعاعوں سے ہی اس کا علاج کیا جا سکتا ہے بس دوائیں ہی استعمال کی جا سکتی ہیں اور ان سے کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے۔ مولانا ندوی کے ذریعہ یہ بات جس وقت مجھے معلوم ہوئی اُس وقت تک عام طور پر یہ بات لوگوں کے علم میں نہیں آئی تھی واقعہ یہ ہے کہ اسی دن سے مولانا کے بارے میں ایک مایوسانہ تشویش دل میں پیدا ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا بمبئی سے دہلی آ گئے اور ان کی صحت و مرض کی رفتار کا حال نجی خطوط سے اور اخبار "الجمعیۃ" کی اطلاعات سے معلوم ہوتا رہا۔ ۲۲ر اپریل کو میں مولانا سے ملاقات اور مزاج پرسی ہی کے لیے دہلی گیا اس وقت مولانا کی حالت دیکھنے میں تشویشناک نہیں تھی بس کینسر کا نام ہی سب کو تشویش میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

میں مولانا کے پاس شام کے وقت گیا تھا یہی ملاقات کا عام وقت بھی تھا، تھوڑی دیر کے بعد جب اور حضرات اٹھنے لگے تو میں نے بھی اُٹھنے کا ارادہ کیا اور اجازت چاہی، مولانا نے مجھے روک لیا، میں نے عرض کیا کہ اس شرط پر بیٹھوں گا کہ آپ باتیں نہ کریں، میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری وجہ سے آپ باتیں کرتے ہیں اور اس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں مولانا کو یہ بتا چکا تھا کہ میرا پروگرام یہاں سے حضرت رائے پوری (قدس سرہ) کی خدمت اقدس میں حاضری کے لیے رائے پور جانے کا ہے، تھوڑی دیر کے بعد جب مغرب کا وقت بالکل قریب آ گیا اور میرے علاوہ جو دوسرے حضرات مولانا کے پاس اس وقت تھے وضو وغیرہ کے لیے اُٹھ گئے اور اتفاق سے میں اکیلا رہ گیا تو مولانا نے فرمایا کہ مجھے ایک بات کہنی تھی "میں کل گذشتہ رائے پور حضرت کی خدمت میں جانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ موٹر وغیرہ کا پورا انتظام ہو گیا تھا اور یہاں میں نے کسی کو اس کی اطلاع نہیں کی تھی، سوچا یہ تھا کہ خاموشی سے صبح نکل جاؤں گا اور رات تک واپس آ جاؤں گا، لیکن کل رات سانس کی تکلیف بڑھ گئی اور مجھے وہ پروگرام ملتوی کر دینا پڑا۔ اب جس دن بھی میری طبیعت ذرا بہتر ہو گی میں انشاء اللہ رائے پور حاضر ہوں گا۔ آپ، حضرت کی خدمت میں یہ بات اور میرا سلام بھی عرض کر دیں"

میں اپنے پروگرام کے مطابق دہلی سے رائے پور گیا اور حضرت اقدس کی خدمت میں مولانا کا سلام پہنچایا اور آنکھوں دیکھا حال بتایا اور حاضری کے ارادہ کے بارے میں مولانا نے مجھ سے جو کچھ فرمایا تھا وہ بھی عرض کیا۔ اگرچہ حضرت کی خانقاہ میں بعد ختم روزانہ پابندی کے ساتھ مولانا کی صحت کے لیے دعا ہوتی تھی۔ لیکن اُس دن حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا پر مرض غالب آ چکا ہے۔ آپ اُنھیں لکھ دیں کہ ایسی حالت میں وہ یہاں آنے کا ارادہ نہ فرمائیں اُنھیں تکلیف ہو گی۔

میں ابھی رائے پور ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ علاج کے لیے مولانا کے امریکہ جانے کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ اس کے بس دو چار ہی دن کے بعد وہ امریکہ روانہ ہو گئے۔ وہاں سے ۱۲ر جولائی کو واپسی ہوئی۔ میں ۱۴ر کو دہلی جا کر مولانا سے ملا، اس وقت مولانا کا بیان یہ تھا کہ وہاں کے معالجین نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جہاں تک کینسر کا تعلق ہے اس کا پورا علاج ہو چکا ہے۔ اب جو شکایتیں باقی ہیں وہ آہستہ آہستہ رفع ہو جائیں گی، لیکن بعض دوسرے بھی ذرائع سے یہ بات ہم لوگوں کو معلوم ہو گئی تھی کہ امریکہ کے معالجین نے مولانا کو مایوس ہو کر واپس کیا ہے اور صرف ان کے دل کی تسلی اور تقویت کے لیے علاج کی کامیابی کا یقین دلا دیا ہے۔ مولانا کی ظاہری حالت اور ضعف و نقاہت (باقی ص ۱۰۱)

ادارۂ فیض القرآن دیوبند (یوپی) کی گرانقدر خدمات

تین مایۂ ناز علمی دینی اور تبلیغی پروگرام

تفسیر ابن کثیر

تفہیم البخاری

جدید تفسیر حقانی

جو

آج ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت پروگرام ہیں

تفصیلات اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

منجانب

مکتبہ فیض القرآن دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

تفسیر سورۂ ابراھیم علیہ السلام

سورۃ ابراہیم مکیۃ وھی ثنتان وخمسون آیۃ وسبع رکوعات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

کلماتہا ۸۴۵　　حروفہا ۳۶۰۱

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ

الرٰ یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف یعنی

رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ

خدائے غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لاویں　وہ ایسا خدا ہے کہ اسی کی ملک ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے　اور جو کچھ زمین میں ہے

وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝۲ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى

اور بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے　ان کافروں کو جو دنیوی زندگانی کو　آخرت پر　ترجیح دیتے

الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ ۢ بَعِيْدٍ ۝۳

ہیں　اور (بلکہ) اللہ کی راہ (مذکور) سے روکتے ہیں　اور اس میں کجی (یعنی شبہات) کے متلاشی رہتے ہیں ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں۔

کتاب منزل

حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں آتے ہیں۔ ان کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ عظیم الشان کتاب ہم نے تیری طرف اتاری ہے۔ کتاب تمام کتابوں سے اعلیٰ، رسول تمام رسولوں سے افضل و بالا۔ جہاں اتری وہ جگہ دنیا کی تمام جگہوں سے بہترین اور عمدہ۔ اس کتاب کا پہلا وصف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے تو لوگوں کو اندھیروں سے اُجالے میں لا سکتا ہے[ع]۔ تیرا پہلا کام یہ ہے کہ گمراہیوں کو ہدایت سے، برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے، ایمانداروں کا حمایتی خود خدا ہے وہ انھیں اندھیریوں سے اجالے میں لاتا ہے اور کافروں کے ساتھی خدا کے سوا اور ہیں جو انھیں نور سے ہٹا کر تاریکیوں میں پھانس دیتے ہیں۔ اللہ اپنے حق پرست بندہ پر اپنی روشن اور واضح نشانیاں اتارتا ہے کہ وہ تمہیں تاریکیوں سے ہٹا کر نور کی طرف پہنچا دے۔ اصل ہادی اللہ ہی ہے، رسولوں کے ہاتھوں جس کی ہدایت اسے منظور ہوتی ہے۔ وہ راہ پا لیتے ہیں اور مغلوب پورے غالب زبردست اور ہر چیز پہ بادشاہ بن جاتے ہیں اور ہر حال میں تعریفوں والے خدا کی راہ کی طرف ان کی رہبری ہو جاتی ہے اَللّٰهِ کی دوسری قرات اَللّٰهُ بھی ہے پہلی قرات بطور صفت کے ہے۔ اور دوسری بطور نئے جملہ کے جیسے آیت قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں جو کافر تیرے مخالف ہیں تجھے نہیں مانتے، انھیں قیامت کے دن سخت عذاب ہوگا۔ یہ لوگ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ دنیا کے لیئے پوری کوشش کرتے ہیں اور آخرت کو بھولے بیٹھے ہیں، رسولوں کی تابعداری سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں راہ خدا جو سیدھی اور صاف ہے۔ اسے ٹیڑھی ترچھی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسی جہالت، ضلالت میں رہیں گے۔ لیکن راہ خدا نہ ٹیڑھی ہوئی ہے نہ ہوگی پھر ایسی حالت میں اُن کی اصلاح کی کیا اُمید۔؟

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ

اور ہم نے تمام (پہلے پیغمبروں کو بھی) ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ ان سے (احکام الٰہیہ کو) بیان کریں　پھر جس کو اللہ تعالیٰ چاہیں گمراہ کرتے ہیں۔

ع یعنی کفر اور گمراہی کی اندھیریوں سے اسلام کے نور ہدایت کی جانب ۱۲ محمد انظر شاہ کشمیری؛

ہمارا دوسرا پروگرام

تفہیم البخاری

معہ مکمل عربی متن و حواشی

مکتبہ فیض القرآن دیوبند سے پہلے پروگرام کے تحت قرآن کریم کی شہرۂ آفاق تفسیر "تفسیر ابن کثیر اردو" کا ایک ایک پارہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ اس کے ساتھ مکتبہ کا دوسرا شاندار کارنامہ تفہیم البخاری ترجمہ اردو صحیح بخاری شریف کی اشاعت ہے۔ اس کے تیس پارے بھی ماہ بماہ ایک ایک پارے کی شکل میں شائع ہورہے ہیں۔

فخر دو عالم سرور کائنات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ مبارکہ کا وہ گراں قدر مجموعہ جو امام عالی مقام امیر المؤمنین فی الحدیث ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے چھ لاکھ احادیثِ نبوی میں سے منتخب فرماکر سولہ سال میں مرتب فرمایا ہے۔

قرآنِ کریم کے بعد دنیا کی وہ مستند ترین اور لاثانی کتاب جس میں قطعی سچی احادیث کا وہ جلیل القدر عظیم الشان علمی خزانہ پوشیدہ ہے جو اسلام کی روح رواں ہے

سابقہ تراجم کی خامیوں کے پیش نظر ترجمہ اُردو بھی زیادہ وقت نظر، صحت و فکر کا محتاج تھا اور حواشی و تشریح کا ایک بہترین خلاصہ بھی ضروری تھا۔ مکتبہ نے مستند علماء کی خدمات حاصل کرکے اکابر علماء امت کی نگرانی میں اس اہم خدمت کی تکمیل کا عزم کیا ہے۔

ہر پارے کی ضخامت ایک سو پچاس صفحات اوسطاً ہوتی ہے۔ سفید عمدہ کاغذ، سائز ۲۰×۳۰/۸۔ کتابت و طباعت کا اونچا معیار۔ ہدیہ ڈھائی روپے فی پارہ۔ یہ رعایت صرف ممبران کے لیے مخصوص ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ فی پارہ۔ عام ہدیہ تین روپے فی پارہ

فیس ممبری

اس سلسلے کی دائمی شرکت کے لیے صرف ایک روپیہ منی آرڈر ارسال فرمایئے۔ ممبران کی خدمت میں ہر ماہ تفہیم البخاری کا ایک پارہ معہ ڈاک خرچ ذریعہ وی، پی مبلغ تین روپے میں ارسال کیا جاتا رہے گا۔ لیکن اگر آپ پانچ دوستوں کے لیے یکجا ہر ماہ ہر پارے کی پانچ کاپیاں منگائیں تو رعایتی وی، پی معہ ڈاک خرچ بارہ روپے کی ارسال ہوگی۔ اس طرح یہ مایہ ناز علمی خزانہ۔ ہر ہر ممبر کے پاس مکمل پہنچ جائے گا۔

نمونہ سامنے والے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں

نوٹ: ـ حسب گنجائش تفہیم البخاری کے ایک سے زائد پارے بھی یکجا ہر ماہ منگائے جاسکتے ہیں بلکہ اس طرح ڈاک خرچ میں کفایت ہوجاتی ہے۔ تجلید کا بھی عمدہ انتظام ہے

مکتبہ فیض القرآن دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

باب ۱۴۶۱

إِذَا قَالَ رَبُّ الْأَرْضِ أُقِرُّكَ مَا أَقَرَّكَ اللهُ وَلَمْ يَذْكُرْ أَجَلًا مَّعْلُومًا فَهُمَا عَلَى تَرَاضِيهِمَا

۲۱۷۵ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ الْمِقْدَامِ حَدَّثَنَا فُضَيْلُ بْنُ سُلَيْمَانَ حَدَّثَنَا مُوسَى أَخْبَرَنَا نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ أَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ حَدَّثَنِي مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَجْلَى الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ وَكَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا ظَهَرَ عَلَى خَيْبَرَ أَرَادَ إِخْرَاجَ الْيَهُودِ مِنْهَا وَكَانَتِ الْأَرْضُ حِينَ ظَهَرَ عَلَيْهَا لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِلْمُسْلِمِينَ وَأَرَادَ إِخْرَاجَ الْيَهُودِ مِنْهَا فَسَأَلَتِ الْيَهُودُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُقِرَّهُمْ بِهَا أَنْ يَكْفُوا عَمَلَهَا وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُقِرُّكُمْ بِهَا عَلَى ذٰلِكَ مَا شِئْنَا فَقَرُّوا بِهَا حَتّٰى أَجْلَاهُمْ عُمَرُ إِلَى تَيْمَاءَ وَأَرِيحَاءَ

جب زمین کے مالک نے کہا کہ میں تمہیں (فلاں زمین پر) اس وقت تک باقی رکھوں گا جب تک خدا چاہیگا، اور کسی متعین مدّت کا ذکر نہیں کیا، تو یہ معاملہ دونوں کی رضامندی پر موقوف ہوگا

حدیث ۲۱۷۵ - ہم سے احمد بن مقدام نے حدیث بیان کی، ان سے فضیل بن سلیمان نے حدیث بیان کی، ان سے موسیٰ نے حدیث بیان کی، انھیں نافع نے خبر دی اور ان سے ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب خیبر پر فتح حاصل کی تھی) اور عبد الرزاق نے کہا کہ انھیں ابن جریج نے خبر دی، کہا کہ مجھ سے موسیٰ بن عقبہ نے حدیث بیان کی، ان سے نافع نے، ان سے ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو سرزمین حجاز سے منتقل کر دیا تھا۔ اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر فتح پائی تھی تو آپ نے بھی یہودیوں کو وہاں سے دوسری جگہ بھیجنا چاہا تھا۔ جب آپ کو وہاں فتح حاصل ہوئی تو اس کی زمین اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ہو گئی تھی، آں حضور کا ارادہ یہودیوں کو وہاں سے منتقل کرنے کا تھا، لیکن یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ ہمیں یہیں رہنے دیں، ہم (خیبر کے نخلستانوں اور آراضی کا) سارا کام خود کریں گے اور اس کی پیداوار کا نصف حصہ لے لیں گے (اور بقیہ نصف خراج مقاسمہ کے طور پر ادا کریں گے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا جب تک ہم چاہیں تمہیں اس شرط پر یہاں رہنے دیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم رہے اور پھر عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں تیما اور اریحا بھیج دیا۔

(حاشیہ لے) یہاں بھی مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے خیبر کی آراضی کا حکومت اسلامیہ ہی کو مالک قرار دیا ہے اور پھر اس سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ بٹائی کا معاملہ مدت کی تعیین کے بغیر بھی، جبکہ فریقین اس پر رضامند ہوں، جائز ہو سکتا ہے، حالانکہ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مدت کے ابہام کی صورت میں نہ مزارعت (کھیت کا بٹائی پر دینا) جائز ہے اور نہ اجارہ۔ اس سے احناف کے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ خیبر کی اراضی کے اصل مالک یہودی ہی تھے اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے معاملہ خراج مقاسمہ کے طور پر تھا کہ اس میں مدت کے تعیین کی ضرورت نہیں ہوتی حدیث کا مفہوم صاف احناف کے مسلک کو ماننے ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ تیما اور اریحا اسلامی حدود مملکت ہی کے شہر ہیں، شام کے قریب۔

ہمارا تیسرا پروگرام

جدید تفسیر حقانی اردو

معہ حواشی و اضافات

قرآن کی خدمت ایک سعادت ہے۔ اور اس میں تعاون تازگیٔ ایمان کی علامت ہے۔ دورِ حاضر کی ایک بڑی ضرورت کو مکمل کرنیوالی تفسیر کا ادارے نے آپ کے لیۓ انتخاب کیا ہے۔

یہ تفسیر دہلی کے مشہور مفسر علامہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب حقانی رح کے علوم قرآنی کا ایک کامیاب اور نادر ذخیرہ ہے۔ جس میں اردو زبان کا بامحاورہ ترجمہ۔ روایاتِ صحیحہ معہ حوالہ کتب، ربط آیات، ترکیب، شان نزول۔ مستند قصص و واقعات اور جملہ مسائل ضروریہ یکجا جمع کردیئے گئے ہیں۔ اس تفسیر میں مخالفین اسلام کے جملہ اعتراضات کے، دنداں شکن مکمل و مدلل جوابات جو دورِ حاضر کے ذہنوں کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتے ہیں۔ موجود ہیں۔ ہم نے اس تفسیر کو عصرِ حاضر کے رجحانات سے زیادہ قریب کرنے اور عام مسلمانوں کے لیۓ اس کو مفید بنانے کے لیۓ مستند علماء کی نگرانی میں صاف ستھرے اور علمی حواشی شریکِ تفسیر کردیئے ہیں۔ عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ۔ کیونکہ مفسر فاضل کے پیشِ نظر عیسائیت اور نیچریت کی تردید تھی اس لیۓ ان کا قلم لطائف قرآنی کو چھوڑتا چلا گیا۔ جدید تفسیر حقانی میں ان تمام لطائف و نکات کو اس طرح سمیٹ لیا گیا کہ اب اس تفسیر کے بعد آپ کسی اور تفسیر کے محتاج نہیں رہیں گے۔

پروگرام

مکمل تفسیر حقانی ۳۵ جزوں میں چھاپی جارہی ہے۔ ہر جزء کی ضخامت اوسطاً ایک سو صفحات، جو ہر ماہ ایک ایک جزء کی شکل میں چھپ رہی ہے۔ سائز ۳۰×۲۰/۸ کاغذ سفید، کتابت و طباعت معیاری، ہر جزء کا ہدیہ ایک روپیہ پچیس نئے پیسے (یہ رعایت صرف ممبران کے لیۓ مخصوص ہے) عام ہدیہ دو روپے فی جزء۔

نمونہ سامنے والے صفحے پر ملاحظہ کیجیۓ

فیس ممبری اس سلسلے کی دائمی شرکت کے لیۓ ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماکر ممبر بن جائیے، ممبران کی خدمت میں ہر ماہ جدید تفسیر حقانی کا ایک ایک جزء بذریعہ وی، پی معہ ڈاک خرچ مبلغ دو روپے میں ارسال کیا جاتا رہے گا لیکن اگر آپ پانچ دوست مل کر ہر جزء کی ہر ماہ پانچ کاپیاں یک جا طلب فرمائیں گے تو رعایتی وی۔ پی معہ ڈاک خرچہ آٹھ روپے کی ارسال ہوگی۔ اس طرح یہ عظیم الشان تفسیر رفتہ رفتہ آپ کی خدمت میں مکمل پہنچ جائے گی۔ تجلید کا بھی انتظام ہے جو فرمائش آنے پر پورا کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دوستوں کو اس متبرک پروگرام میں شریک کیجیے۔

دیگر تفصیلات کے لیۓ لکھیۓ

مکتبہ فیض القرآن دیوبند ضلع سہارنپور یوپی

پر چڑھ کر خطبہ پڑھتا ہے جس میں خدا کی توحید و تقدیس اور گناہوں سے معافی اور اس کی حمد و ثنا اور احکام حج کا بیان ہوتا ہے دن غروب ہوتے ہی یہاں سے خلق خدا چل پڑتی ہے اور مغرب و عشاء کی نماز لوٹ کر مزدلفہ میں پڑھتے ہیں اور پھر صبح کو یہاں سے اُٹھ کر منیٰ میں آکر قربانی کرتے ہیں۔ شیعہ لوگ دسویں کو بھی عرفات میں رہتے ہیں۔

آگے چل کر ہم اسرار و احکام حج بیان کریں گے۔ اب ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام سے کعبہ تعمیر ہونے کا ذکر ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ

اور جبکہ کہا ابراہیم نے اے رب اس کو امن کا شہر کر دے اور یہاں کے باشندوں کو میووں کی روزی دیجیو اس کو کہ جو ان میں سے اللہ اور قیامت

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ

ایمان لائے (اللہ) نے فرمایا جو کافر ہے اس کو بھی میں کسی قدر فائدہ دوں گا پھر اس کو کھینچکر ڈالدونگا عذاب میں اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

ترکیب

و حرف عطف جملہ بر کلام سابق قَالَ فعل ابراھیم فاعل رب اجعل الخ جملہ مقولہ اجعل بمعنی صیر ھذا مفعول اول بلدا مفعول ثانی موصوف آمنا صفت جملہ معطوف علیہ وارزق معطوف بر اجعل انت اس کا فاعل اھلہ مفعول من الثمرات متعلق ہے ارزق سے من الخ اھلہ سے بدل بعض ہے من موصولہ آمن منہم باللہ والیوم الآخر جملہ اس کا صلہ قال فعل اللہ فاعل اس کا ومن کفر الخ جملہ اس کا مقولہ من بمعنی الذی کفر ای یکفر اس کا صلہ محلاً یہ منصوب ہے تقدیر قال وارزق من کفر پس ارزق فعل محذوف ہے اس پر فامتعہ دلالت کرتا ہے۔

تفسیر

خدا تعالیٰ فرماتا ہے یہ خیر و برکات اور یہ تمام رسومات شریعت جو کعبہ سے متعلق ہیں۔ ابراہیم ؑ کی دعا سے ظہور میں آئی ہیں۔ یاد کرو جب ابراہیم بنا رکعبہ سے فارغ ہوئے تو ہم سے دعا کی۔ الٰہی اگر تو نے کعبہ کو مثابہ اور امن فرمایا ہے تو اس جگہ ایک شہر دارالامن بھی بنا۔ تاکہ آنے والوں کے لیئے ہر قسم کا آرام رہے اور یہ لوگ ہمیشہ اس گھر کی خبر گیری کیا کریں اور یہاں کے رہنے والوں کو جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاویں میوے بھی کھانا کیونکہ یہ خشک پہاڑ ہے اگر ایسا نہ ہوگا تو یہاں قیام مشکل ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیشتر عہد نبوت کے اپنی اولاد کے لیئے عموماً دعا کی تھی۔ اس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا کافر اس کے مستحق نہیں یہاں حضرت ابراہیم ؑ نے دعا میں اس بات کا لحاظ کر کے روزی و رزق کی مسلمانوں کے لیئے خاص کر کے دعا کی چونکہ نبوت اور رزق و روزی میں فرق ہے نبوت کا ہر شخص سزاوار نہیں بخلاف رزق و روزی کے کہ وہ اس کی رزاقیت کے طفیل سے سب نیک و بد کو ملتی ہے اس لیئے خدا تعالیٰ نے فرمایا چند روز کافروں کو بھی میں دنیا سے بہرہ مند کروں گا یعنی تا حیات دنیا پھر اس کے بعد تو وہ کھینچکر عذاب جہنم میں ڈال دیئے جاویں گے جو نہایت خراب جگہ ہے ف خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم ؑ کی یہ دعا قبول کی کہ شہر کو دارالامن بھی کر دیا ہمیشہ یہاں کا ہر کوئی ادب کرتا تھا۔ کوئی کسی کو یہاں نہ مارتا تھا اور ثمرات کے لیئے یہ تدبیر کی کہ مکہ سے تھوڑی دور فاصلہ پر ایک ایسا قطعہ شاداب و سرسبز بنایا جہاں روئے زمین کے اعلیٰ سیر حاصل زمینوں سے بڑھ کر میوے پیدا ہوتے ہیں انار، انگور اور بہت سی عمدہ عمدہ چیزیں وہاں سے آکر مکہ میں ارزاں اور تر و تازہ فروخت ہوتی ہیں اس جگہ کا نام طائف ہے۔

پروگرام یکجا منگائیے

اگر آپ

- ★ اگر آپ کسی بھی دو پروگراموں کے لیئے ممبر بننا چاہیں تو دو روپے فیس ممبری ارسال فرمائیے۔ اسی طرح اگر آپ تین پروگراموں کے لیئے ممبر بننا چاہیں تو تین روپے فیس ممبری ارسال فرمائیے
- ★ اگر آپ تفسیر ابن کثیر، تفہیم البخاری اور جدید تفسیر حقانی کا ایک ایک جز یکجا منگائیں تو معہ ڈاک خرچ چھ روپے کی وی، پی ارسال ہوگی۔
- ★ اگر آپ تفسیر ابن کثیر اور تفہیم البخاری یا جدید تفسیر حقانی اور تفہیم البخاری کا ایک ایک جز یکجا منگائیں تو معہ ڈاک خرچ چار روپے پچاس نئے پیسے کی وی پی ارسال ہوگی۔
- ★ اگر آپ تفسیر ابن کثیر اور جدید تفسیر حقانی کا ایک ایک جز یکجا منگائیں تو معہ ڈاک خرچ تین روپے ساٹھ نئے پیسے کی وی، پی ارسال ہوگی۔
- ★ اگر آپ مجموعی طور پر بیس پارے یا اس سے زائد یکجا منگا رہے ہیں تو ریلوے اسٹیشن کا نام صاف انگریزی میں تحریر فرمائیں تاکہ پارے بذریعہ سواری گاڑی اور ریلوے رسید وی پی سے روانہ ہوسکے اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔
- ★ اگر آپ خط و کتابت میں ممبری نمبر کا حوالہ نہیں دیں گے تو جواب میں فوری تعمیل نہیں ہوگی۔
- ★ اگر آپ مختلف دوست مل کر یکجا پارے کسی ایک ہی شخص کے پتہ پر منگائیں گے تو اس شکل میں آپ کے دو فائدے ہوں گے (۱) فیس ممبری صرف ایک شخص کے لیئے جمع ہوگی (۲) ڈاک خرچ میں غیر معمولی کفایت ہو جائیگی
- ★ اگر آپ پاکستانی خریدار ہیں تو تفسیر ابن کثیر کیلیئے ابتدائی پانچ جزوں کا ہدیہ مع ڈاک خرچہ و فیس ممبری نو روپے تفہیم البخاری کیلیئے ابتدائی پانچ پاروں کا ہدیہ مع فیس ممبری اور ڈاک خرچ تیرہ روپے، اور جدید تفسیر حقانی کیلیئے ابتدائی پانچ جزوں کا ہدیہ معہ ڈاک خرچ و فیس ممبری مبلغ نو روپے مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں حافظ عزیز الرحمن صاحب مکان نمبر ۲۲۳-P مین بازار محلہ سنت پورہ لائل پور (مغربی پاکستان) رسید براہ راست مکتبہ فیض القرآن دیوبند کو روانہ کریں۔ دفتر سے پارے بذریعہ رجسٹری روانہ ہوں گے اور مزید آئندہ پاروں کیلیئے رقم طلب کی جائے گی۔ اس طرح یہ سلسلہ تا اختتام جاری رہے گا۔

مکتبہ فیض القرآن دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

Regd. A. 1743

MASHRAB Monthly
DEOBAND (U.P.)

MUJAHID - E - MILLAT NUMBER